اسلام اور تہذیبِ مغرب کی کشمکش

ایک تجزیہ، ایک مطالعہ

ڈاکٹر محمد امین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی زیر اہتمام

محدث لائبریری

کتاب وسنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے

کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے

درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

KitaboSunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش

ایک تجزیہ، ایک مطالعہ

ڈاکٹر محمد امین

دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

۲۹۷،۲۶۲۱ محمد امین، ڈاکٹر
م ح م ۔ ا اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش
لاہور: بیت الحکمت
۲۰۰۶ء
ص: ۲۱۶
ا۔ اسلام، مغربی تہذیب، تاریخ
ISBN 969-8773-52-5

کتاب: اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش
مصنف: ڈاکٹر محمد امین ایم اے، پی ایچ ڈی
اہتمام: بیت الحکمت، لاہور
مطبع: موٹروے پریس، لاہور
قیمت: ۱۳۰ روپے

فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ
اُردو بازار، لاہور فون: 7320318
ای میل: hikmat100@hotmail.com

کراچی میں ملنے کا پتہ
فضلی بک سپر مارکیٹ، اُردو بازار، کراچی ۰۲۱:۲۲۱۲۹۹۱

یورپ کی غلامی پہ رضا مند ہوا تُو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

مضامین ایک نظر میں

حصہ اوّل

مغربی تہذیب کے بارے میں مسلمانوں کے ممکنہ رویے

حصہ دوم

مسلم معاشرے پر مغربی تہذیب کے اثرات۔ پاکستانی تناظر میں

فہرست مضامین

حصہ اوّل

مغربی تہذیب کے بارے میں مسلمانوں کے ممکنہ رویے

حصہ دوم

مسلم معاشرے پر مغربی تہذیب کے اثرات۔ پاکستانی تناظر میں

پیش لفظ

عصرِ حاضر میں مسلمانوں کو جو چیلنج اور مسائل درپیش ہیں، ایسے مسائل جن کا تعلق ان کی کمزوری اور ذلت ونکبت کے بنیادی اسباب سے ہے اور جن سے عہدہ برآ ہوئے بغیر ان کی دنیا سنور سکتی ہے اور نہ آخرت، وہ بنیادی طور پر دو ہیں۔ داخلی لحاظ سے دینی تقاضوں پر عمل نہ کرنا اور اپنے نظریۂ حیات سے وابستگی کے حوالے سے منافقانہ روّیہ اختیار کرنا؛ اور خارجی لحاظ سے مغربی فکر وتہذیب کو اپنے مسائل کا حل سمجھ کر اس کی پیروی کرنا اور اس کے الحادی اور اسلام و مسلم دشمن رویے کو نظر انداز کرنا۔

مغربی تہذیب کے حوالے سے جو چیلنج مسلمانوں کو درپیش ہے، ہم اس سے پہلے اس کا ذکر اپنی تحریروں میں ضمناً کرتے رہے ہیں لیکن اب ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ اس موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے براہ راست زیرِ بحث لایا جائے، چنانچہ اس وقت جو کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے اس میں ہم نے دو اہم امور پر بحث کی ہے۔ ایک تو یہ کہ مسلمانوں کا مغربی تہذیب کے بارے میں رویہ کیا ہونا چاہیے، وہ اسے ردّ کر دیں، قبول کر لیں یا اس سے مفاہمت کر لیں؟ ہم نے ان تینوں نقطۂ ہائے نظر کے مؤیدین کے دلائل ذکر کرنے کے بعد ان کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنا نقطۂ نظر بھی تفصیل کے ساتھ پیش کر دیا ہے اور اس سوال کا واضح جواب دیا ہے۔

دوسرا معاملہ جو ہم اس کتاب میں زیرِ بحث لائے ہیں، وہ مسلم معاشرے پر مغربی تہذیب کے اثرات کا ہے۔ یہ کام ہم نے برصغیر خصوصاً پاکستان کے تناظر میں کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مسلم معاشرے کے بیدار عناصر نے اپنے لوگوں کو مغرب کی غلامی سے نکالنے کے لیے جدوجہد کی ہے، جمہور مسلمانوں نے اس میں عملاً ان کا ساتھ دیا ہے۔ اسی طرح دینی عناصر نے مسلمانوں کو اسلام سے وابستگی اختیار کرنے اور مغربی

فکروتہذیب سے بچانے کے لیے جو کوششیں کی ہیں، اس کی بھی انہوں نے اصولاً حمایت کی ہے، تاہم اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ زوال وادبار کی پچھلی دوصدیوں میں مغربی استعمار اپنی قوت قاہرہ اور روباہی فراست سے مسلم معاشرے پر اثر انداز ہونے میں کسی حد تک کامیاب رہا ہے اور مغربی تہذیب کے بہت سے افکار وتصورات مسلم معاشرے میں بتدریج جگہ بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں، جن کا اب ہمیں، خصوصاً نئی نسل کو، احساس بھی نہیں ہوتا اور نہ ان درآمدی نظریات اور اداروں سے غیریت اور اجنبیت محسوس ہوتی ہے۔ لہٰذا اس چیز کی ضرورت محسوس ہوتی تھی کہ مغرب سے درآمد شدہ ان نظریات وتصورات اور اداروں کی نشان دہی کی جائے اور ان کا اسلامی تعلیمات وتصورات سے مختلف ومتضاد ہونا واضح کیا جائے۔ یہ کام ہم نے اس تحریر کے دوسرے حصے میں کیا ہے اور اس کی ابتدا میں اس کے اسباب ومظاہر کا ذکر بھی کر دیا ہے۔ اس مضمون کے آخر میں ہم نے اس صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کی ضرورت واہمیت اور اس کے طریق کار کی وضاحت بھی کر دی ہے۔

یہ دونوں مضامین اگرچہ اسلامی تناظر میں مغربی تہذیب سے بحث کرتے ہیں تاہم وہ باہم کلی طور پر مربوط نہ تھے، اس لیے ہم نے انہیں ابواب کی صورت دینے کی بجائے کتاب کے حصہ اول اور حصہ دوم کے طور پر پیش کیا ہے۔

یہ ابتدا ہے۔ ہمارے ذہن میں مغربی تہذیب کے حوالے سے تصنیف وتالیف کا ایک تفصیلی نقشہ موجود ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو مستقبل میں قارئین کو اس حوالے سے مزید مواد مطالعہ کے لیے ملے گا۔

وما توفیقی الا باللہ، علیہ توکلت والیہ انیب.

لاہور ۱۱ مارچ ۲۰۰۶ء　　　　محمد امین

حصۂ اوّل

مغربی تہذیب کے بارے میں مسلمانوں کے ممکنہ رویے

مغربی تہذیب کے بارے میں مسلمانوں کے ممکنہ رویے

عصر حاضر میں مسلمانوں کو جو مسائل اور چیلنجز درپیش ہیں ان میں سے ایک اہم مسئلہ اور چیلنج یہ ہے کہ مغربی تہذیب کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے ان کا رویہ کیا ہونا چاہیے؟ بظاہر اس کی تین ہی صورتیں ممکن نظر آتی ہیں:

ایک: یہ کہ مغربی تہذیب کو رد کر دیا جائے

دوسرے: یہ کہ مغربی تہذیب کو قبول کر لیا جائے

تیسرے: یہ کہ مغربی تہذیب کے ساتھ مفاہمت کر لی جائے

آئندہ سطور میں ہم ان تینوں رویوں یا نقطۂ ہائے نظر کے حامیوں کے دلائل پیش کریں گے اور ان کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنی رائے قارئین کے سامنے رکھیں گے۔

وباللہ التوفیق۔

پہلا رویہ : مغربی تہذیب کو رد کر دیا جائے

مسلمانوں کی ایک بڑی اکثریت یہ رائے رکھتی ہے کہ انہیں مغربی تہذیب کو رد کر دینا چاہیے۔اس کے لیے جو دلائل دیے جاتے ہیں ان کے اہم عناوین یہ ہیں:

۱۔ مسلمانوں کی ایک آزاد اور مستقل فکر، دین اور تہذیب ہے۔

۲۔ اہل مغرب بھی ایک الگ اور مستقل فکر اور تہذیب رکھتے ہیں۔

۳۔ یہ دونوں فکریں اور تہذیبیں اپنی اساس میں ایک دوسرے سے مختلف بلکہ باہم متضاد ہیں۔

۴۔ قرآن وسنت کی ایک مستقل اور ناقابل تغیر ہدایت یہ ہے کہ یہود ونصاریٰ مسلمانوں کے دشمن ہیں۔

۵۔ اہل مغرب کا رویہ عملاً مسلمانوں کے ساتھ مستقل دشمنی کا ہے۔

اب ہم ان مباحث کی کچھ تفصیل عرض کرتے ہیں!

۱۔ مسلمانوں کی ایک مستقل فکر، مخصوص دین اور منفرد تہذیب ہے

مسلمانوں کا ایک دین ہے، منفرد فکر ہے، مخصوص عقائد ہیں اور ایک خاص ورلڈ ویو (تصور انسان، تصور کائنات اور تصور الٰہ) ہے جو انہیں ایک امتیازی نظریۂ حیات عطا کرتا ہے۔ان مخصوص فکری اساسات کی بنیاد پر ان کا ایک خاص طرز زندگی تشکیل پاتا ہے اور ان کی اجتماعیت اور تہذیب وثقافت کی عظیم الشان عمارت وجود میں آتی ہے۔اس لیے وہ دوسرے افراد اور قوموں سے الگ اپنا ایک منفرد مقام اور مخصوص وجود اور پہچان رکھتے ہیں۔وہ نہ تو کسی دوسرے ایسے معاشرے میں ضم ہو سکتے ہیں اور نہ اس کے زیر تسلط رہ سکتے ہیں جس کا دین، جس کی فکر، جس کا ورلڈ ویو اور جس کی تہذیب وثقافت ان کے دین اور ان کی تہذیب کے متضاد ہو۔

یہی وہ فکری اور عملی اساس ہے جس کا اظہار اس حقیقت کی صورت میں ہوا کہ

جاہلی معاشرے میں قیادت کی پیشکش ٹھکراتے ہوئے [۱] پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ نے اسلامی معاشرے کی بنیاد رکھی اور مدینے کی اسلامی ریاست کی تشکیل کی۔ اسی حقیقت کا اظہار ماضیٔ قریب میں برصغیر میں دو قومی نظریے کی تحریک کی صورت میں ہوا۔ برصغیر کے مسلمانوں نے اس تحریک کی بے مثال حمایت کی اور اس کے نتیجے میں برصغیر تقسیم ہوا اور وہ علاقے جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی وہاں پاکستان کے نام سے مسلم ریاست وجود میں آئی۔ اس تحریک کے قائد محمد علی جناح نے ایک دفعہ کہا تھا کہ پاکستان کی بنیاد اسی دن رکھ دی گئی تھی جس دن پہلا ہندوستانی مسلمان ہوا تھا۔ دو قومی نظریہ یا نظریۂ پاکستان دراصل نظریۂ اسلام ہی ہے جس کا سادہ مفہوم یہ ہے کہ مسلمان اپنے عقیدے کی بنیاد پر ایک قوم ہیں اور مغرب کا نظریۂ قومیت جو علاقے، زبان، رنگ اور نسل کی اساس پر قومیت کی تشکیل کرتا ہے، اس کا اطلاق مسلمانوں پر نہیں ہوتا۔ اسی بنا پر جہاں بھی مغربی قوموں نے مسلمان ملکوں پر قبضہ کیا، وہاں ان کی شدید مزاحمت ہوئی اور اس مزاحمت کی قیادت بنیادی طور پر دینی قوتوں نے کی یا اگر دوسری قیادت سامنے آئی تو اس نے بھی جدوجہد اسلامی اساس ہی پر کی کہ مسلمان اپنے منفرد عقیدے اور مخصوص تہذیب کی بنا پر آزاد ریاست کے متمنی اور خواہاں ہیں اور یہ کہ کسی غیر مسلم اقتدار میں وہ اپنی زندگی نہیں گزار سکتے۔

اسی بنا پر اس لطیفے میں انتہائی سنجیدہ حقیقت کی نشاندہی کی گئی ہے جو یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دفعہ کسی نے خاکسار تحریک کے قائد علامہ مشرقی سے پوچھا کہ قرآن حکیم میں ہر سوال کا جواب موجود ہے لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ اگر مسلمان غلام ہو جائیں تو وہ آزادی کیسے حاصل کریں؟ علامہ صاحب نے زہر خند سے کہا: غالباً اللہ تعالیٰ کو معلوم نہیں تھا کہ مسلمان غلام بھی ہو سکتے ہیں۔ [۲]

۱۔ ابن سید الناس، عیون الاثر، ج ۱، ص ۱۰۵، طبع القاہرہ

۲۔ یہ بات بعض دوسرے بزرگوں سے بھی منسوب ہے۔

اور اسی وجہ سے اسلام میں ہجرت کا تصور دیا گیا ہے کہ اگر مسلمان کسی جگہ کفار کے تسلط اور جبر کی وجہ سے اپنے عقائد و افکار کے مطابق زندگی نہ گزار سکیں تو وہ یہ علاقہ چھوڑ کر کسی ایسی جگہ چلے جائیں جہاں وہ اپنے عقائد و افکار کے مطابق زندگی بسر کر سکیں خصوصاً اگر کوئی مسلم ریاست ایسی ہو جہاں انہیں یہ آسانی میسر ہو تو ان پر واجب ہے کہ وہ اس کی طرف ہجرت کریں۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے ان مسلمانوں کے ایمان کی نفی کی جنہوں نے مدینے کا اسلامی مرکز قائم ہو جانے کے بعد اس کی طرف ہجرت نہ کی[1] اور یہی وجہ ہے کہ مسلمان فقہا کسی شدید مجبوری یا کسی ضروری دینی مصلحت کے بغیر اسلامی معاشرے (دارالاسلام) کو چھوڑ کر غیر اسلامی معاشرے (دارالکفر) میں جا کر بسنے کی ممانعت کرتے ہیں مبادا کہ ان کا وجود اور ان کی پہچان (identity) خطرے میں پڑ جائے یا اپنے معتقدات پر عمل کرنے میں انہیں دقت پیش آئے۔

تو خلاصہ یہ کہ مسلمان اپنے عقیدے، اپنے دین اور اپنی تہذیب کی بنیاد پر ایک منفرد اور مستقل قوم ہیں۔

مسلم فکر و تہذیب دنیاوی ترقی اور کامیابی کی کلید ہے

اور یہ بات بھی واضح ہے کہ مسلمانوں کا دین انہیں دنیا و آخرت دونوں میں کامیابی کی ضمانت دیتا ہے۔[2] ہر مسلمان جانتا ہے کہ اسلام کا مقصود و منتہا آخرت میں اللہ کی خوشنودی ہے۔[3] انسان اللہ کا عبد یعنی بندہ اور غلام ہے[4] اور اس کا کام یہ

۱۔ النساء ۴:۹۲

۲۔ البقرہ ۲:۲۰۱، الانبیاء ۲۱:۱۰۵، المائدہ ۵:۱۱۹

۳۔ آل عمران ۳:۱۸۵، العنکبوت ۲۹:۶۴

۴۔ البقرہ ۲:۲۰۷، الفتح ۴۸:۲۹، الذاریات ۵۱:۵۶

ہے کہ دنیا کی یہ زندگی اللہ کے احکام کے مطابق گزارے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو آخرت میں اللہ کی خوشنودی اور اس کی نعمتوں سے متمتع ہوگا اور اگر دنیا کی زندگی اللہ کے احکام کی خلاف ورزی میں گزارے گا تو اس کی ناراضی مول لے گا اور سزا کا مستحق ٹھہرے گا۔

اسی طرح قرآن وسنت کی تعلیمات مسلمانوں کو یہ یقین دہانی بھی کراتی ہیں کہ اگر وہ بحیثیت قوم اور معاشرہ اس دنیا میں اللہ کے رستے پر چلیں تو دنیاوی کامیابی ان کے قدم چومے گی اور انہیں دنیا میں بھی عزت، وقار، کامیابی اور خوشحالی ملے گی [۱] جب کہ اللہ کی اطاعت کے نتیجے میں آخرت کی کامیابی تو حتمی ہے ہی۔

مسلمان معاشرہ بحیثیت مجموعی جب تک اسلامی تعلیمات پر عمل کرتا رہا وہی دنیا میں غالب رہا۔ وہ تعلیم، تحقیق، سماجی علوم، سائنس و ٹیکنالوجی، معیشت، معاشرت، دفاع غرض زندگی کے سارے شعبوں میں ساری دنیا سے آگے تھا لیکن جب اس نے اسلامی تعلیمات اور اس کے تقاضوں پر عمل چھوڑ دیا تو وہ دنیاوی لحاظ سے بھی کمزور و ناتواں ہوگیا اور حریفوں کے لیے ترنوالہ ثابت ہوا جنھوں نے اسے زیر کرنے میں ایک لحظہ کی دیر نہ کی۔

مسلمانوں کا دین اور دین کے بنیادی مآخذ (قرآن وسنت) ان کے پاس محفوظ ہیں۔ ماضی کے علوم ان کے پاس محفوظ ہیں، اسلاف کا سوانحی ریکارڈ محفوظ ہے، ان کے پاس امت کا تعامل بھی محفوظ ہے کہ مسلمان معاشرہ (ایک دو چھوٹی جگہوں کو چھوڑ کر) بڑی حد تک بلا انقطاع ان روایات و اقدار کا تسلسل مہیا کرتا ہے۔ لہٰذا مسلمان دوبارہ اٹھ سکتے ہیں، وہ دوبارہ کامیاب ہوکر عظمت رفتہ حاصل کر سکتے ہیں۔ توانائی کا سرچشمہ ان کے داخلی ڈھانچے کے اندر موجود ہے لہٰذا ان کی نشاۃ ثانیہ بالکل ممکن ہے شرط بس یہ ہے کہ وہ اپنے دین، اپنے نظریے اور اپنی تہذیب سے جڑ جائیں، جیسے

۱۔ الانبیاء،۲۱: ۱۰۵، نوح ۷۱: ۱۰۔۱۳

کہ اس کا حق ہے، کمٹمنٹ کے ساتھ، پوری قوت وابستگی کے ساتھ، ایثار و قربانی کے جذبے کے ساتھ۔

۲۔ اہل مغرب بھی ایک منفرد فکر اور مخصوص تہذیب رکھتے ہیں

جس طرح مسلمانوں کا ایک مخصوص ورلڈ ویو ہے، ان کا ایک خاص عقیدہ اور دین ہے اور اس پر مبنی ایک منفرد تہذیب ہے۔ اسی طرح اہل مغرب کا بھی ایک خاص ورلڈ ویو ہے، ان کی بھی ایک مخصوص فکر ہے اور ان فکری اساسات کی بنیاد پر ان کی بھی ایک منفرد تہذیب ہے۔ چونکہ یہاں تفصیل ہمارے پیش نظر نہیں۔ اس لیے ہم انتہائی اختصار کے ساتھ مغربی فکر و تہذیب کے اہم اصولوں کا یہاں ذکر کریں گے۔

جب مسلمانوں کا دورِ عروج تھا تو مغرب قعرِ ظلمات میں ڈوبا ہوا تھا۔ ان میں تعلیم تھی نہ شائستگی۔ یورپ کے شہر گندے اور گلیاں تاریک ہوتی تھیں، لوگوں کو غسل تک کرنے کی عادت نہ تھی۔ مسلمانوں سے شکست کھانے اور بیت المقدس اور قسطنطنیہ جیسے اہم مذہبی مقامات سے محروم ہونے کے بعد ان کے دل میں مسلمانوں کے خلاف نفرت، انتقام اور غصے کے جذبات بھرے ہوئے تھے۔ اس حریفانہ جذبے نے ان کے ہاں بیداری کی لہر اٹھائی اور مغرب میں احیائے علوم کی تحریک چلی۔ (گو وہ بھی اسلامی اندلس کی یونیورسٹیوں سے کسب فیض کا نتیجہ تھی)۔ چونکہ عیسائی دینی قیادت یا پاپائیت جاگیرداروں اور حکمرانوں کے ساتھ مل کر ایک ظالم اور استبدادی طبقے کی حیثیت اختیار کر چکی تھی اور غیر عقلی، غیر فطری اور بگڑی ہوئی (منحرف) دینی تعلیمات کی پشتیبان تھی؛ نیز روشن خیالی، وسعت نظری، سائنسی فکر اور بحیثیت مجموعی تعمیری تبدیلی کی راہ میں مزاحم تھی لہٰذا احیائے علوم کے ساتھ ہی مذہبی اصلاح کی تحریک چلی جس نے اس دینی قیادت کو پہلے تو چیلنج کیا، پھر تقسیم اور کمزور کیا اور دینی نصوص کی عقلی اور عوامی تعبیر کا راستہ کھولا۔ پھر بعد میں چلنے والی فکری تحریکوں یعنی تحریک تنویر، تحریک رومانویت اور تحریک جدیدیت نے مغرب میں مذہب کی بساط لپیٹ کر رکھ دی۔ ان فکری تحریکوں

نے ایک طرف تو مذہب کو فرد کا ذاتی اور نجی مسئلہ قرار دے کر اسے اجتماعی زندگی کے وسیع میدان سے دیس نکالا دیا (سیکولرزم) تو دوسری طرف فرد کو مکمل طور پر مادر پدر آزادی اور خود مختاری دے کر اسے خدا کے مقابلے میں مختار مطلق بنا دیا (ہیومنزم) اور دنیا ہی کی کامیابی کو اپنا ہدف و مطمح نظر اور ہر قسم کی انسانی سرگرمیوں اور اہداف کا مرکز قرار دے کر آخرت کے تصور کو بے معنی کر دیا (میٹیریلزم) اور وحی کی برتری کا انکار کرتے ہوئے عقل، حس اور تجربہ و مشاہدہ کو معیار حق و باطل قرار دیا (امپریسزم) اور اسی طرح رسالت کے ادارے کو ملیا میٹ کر دیا اور آزادی کے دل فریب نعرے کی آڑ میں عورت کو مکمل آزادی دے کر جنسی اباحت، عریانی، فحاشی اور زناکاری کو رواج دیا۔ خاندانی نظام کو برباد کیا، عورت کو متاع بازار بنایا۔ اور یوں معاشرت کا ستیاناس کر دیا (لبرلزم)۔ فرائڈ نے جنسی جبلت کو مرکزی حیثیت دے کر اور ہر قیمت پر اس کی تسکین کو ذہنی صحت کے لیے ضروری قرار دے کر مغربی فرد کو جنس زدہ حیوان بنا دیا (فرائیڈازم) اور ڈارون نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہ انسان بھی دوسرے جانداروں کی طرح ایک حیوان ہی ہے، اس کے اشرف المخلوقات ہونے کے تصور کو دریا برد کر دیا (ڈارونزم)۔ مغرب کی سیاسی فکر کے مطابق آزادی کا تقاضا ہے کہ اس کے نمائندے پارلیمنٹ میں جو قانون چاہیں بنائیں یعنی جس چیز کو چاہیں حلال قرار دیں اور جس کو چاہیں حرام کہہ دیں۔ چنانچہ مغربی ممالک کی اسمبلیاں شراب، زنا، جوئے، ہم جنس شادی وغیرہ کو حلال قرار دے چکی ہیں (ڈیموکریسی)۔ اسی طرح مغرب کے معاشی مفکرین کے مطابق جب دنیا کی زندگی ہی سب کچھ ہے تو یہاں ہر قیمت پر خوشحالی آنی چاہیے اور پیسہ وافر ہونا چاہیے تاکہ آسائشوں اور نعمتوں (بلکہ لامحدود عیاشیوں) کا سامان کیا جا سکے) چنانچہ سرمائے کی بڑھوتری کے لیے سود، سٹہ اور ہر قسم کے (جائز و ناجائز) ذرائع اختیار کرنے کا مسلک اپنایا گیا (کیپٹل ازم)۔

گویا مغربی فکر و تہذیب کا خلاصہ یہ ہے:

- انسان کو خدا اور مختار مطلق بنا دینا (یعنی اصل خدا کی چھٹی)
- دنیا ہی کو سب کچھ سمجھنا (گویا آخرت کی نفی)
- تجربے اور مشاہدے کو معیار حق سمجھنا (یعنی وحی اور رسالت کا خاتمہ)

اسلامی حوالے سے اس کا کیا مطلب ہے؟ توحید، رسالت اور آخرت کی نفی۔

انہی فکری اساسات کی بنیاد پر مغربی علوم پروان چڑھے ہیں، سائنس وٹیکنالوجی کو ترقی ہوئی ہے، انفرادی اور اجتماعی رویوں کی تشکیل ہوئی ہے اور وہاں ایک مخصوص تہذیب وثقافت نے جنم لیا ہے۔

۳۔ اسلامی اور مغربی فکر وتہذیب ایک دوسرے کی ضد ہیں

اسلامی اور مغربی فکر وتہذیب کی مذکورہ بالا اساسات کا ایک مختصر سا مقارنہ درج ذیل ہے:

اسلامی فکر وتہذیب	مغربی فکر وتہذیب
ا۔ انسان اللہ کا عبد ہے اور اپنے خالق و مالک کی خوشنودی اور اس کی عبادت و اطاعت ہی اس کا آخری ہدف ہے۔	ا۔ انسان اپنا خدا خود ہے اور جو فیصلے چاہے کر سکتا ہے۔
۲۔ ہر قیمت پر اخروی کامیابی۔ آخرت کو دنیا کی زندگی پر ترجیح	۲۔ ہر قیمت پر دنیاوی ترقی کہ دنیا کی زندگی ہی سب کچھ ہے۔
۳۔ دنیا کی محبت گناہوں کی جڑ ہے۔	۳۔ مادہ پرستی اور دنیا سے محبت ترقی کی معراج۔
۴۔ عفت وعصمت، حیا، نکاح اور خاندان کے اداروں کی حمایت	۴۔ عورت کی مادر پدر آزادی اور خاندان کا خاتمہ
۵۔ عورت اور مرد کا الگ دائرہ کار نیز متقی اور فاجر میں فرق	۵۔ مساوات یعنی عورت و مرد ہر لحاظ سے برابر اور ہر فرد کی رائے برابر

۶۔ یہ اختیار صرف اللہ اور اس کے رسول کا ہے، تاہم اس کے تحت قانون سازی کی اجازت	۶۔فرد اور اس کے نمائندوں یعنی ارکان پارلیمنٹ کو حلال و حرام کے تعین کا لامحدود حق (شراب، زنا، سود، جوا وغیرہ حلال)
۷۔ رزق حلال، سادگی، قناعت، انفاق اور صلہ رحمی۔	۷۔ ہر قیمت پر سرمائے کی بڑھوتری، خواہ سود، سٹہ کے ذریعے ہو۔

❁❁❁❁❁❁❁

خلاصہ یہ کہ مسلمانوں اور اہل مغرب کا ورلڈ ویو اور تصور دین ایک دوسرے سے مختلف بلکہ متضاد ہیں۔ مسلمانوں کے ہاں دین کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا حکم ہر معاملے میں غالب ہوگا، عبادات میں بھی، اخلاق میں بھی اور دنیا کے سارے معاملات میں بھی۔ مغرب میں دین ہے ہی نہیں۔ ان کے ہاں صرف مذہب (religion) ہے اور جدید مغربی افکار نے اسے بھی کونے میں (عوامی زبان میں کھڈے لائن) لگا دیا ہے، چنانچہ عیسائیت مغرب میں برائے نام رہ گئی ہے اور سیکولرزم، ہیومنزم، لبرلزم وغیرہ سے شکست کھا چکی ہے۔ اب عیسائیت کا مطلب ہے کبھی کبھار چرچ چلے جانا اور وہاں دعائیہ کلمات گا کر واپس آ جانا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ عملی زندگی سے اس کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔

مغرب کا اصل دین کیا ہے؟ مغرب کا اصل دین یعنی جس کے مطابق وہاں کے لوگ زندگی گزارتے ہیں، جن اصولوں کو مانتے ہیں، جن پر روزمرہ زندگی میں عمل کرتے ہیں، وہ ہیں ہیومنزم برلزم، سیکولرزم ...... وغیرہ اور ان کی بنیاد پر انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین۔ گویا یہی ان کا دین ہیں لیکن ان پر دین یا مذہب کی اصطلاح کا اطلاق غالباً وہ دو وجوہ سے نہیں کرتے۔ ایک تو یہ کہ انہیں مذہب کے لفظ سے چڑ ہے اور جو مذہب ان کی اجتماعی زندگی میں دخل دے وہ اسے صدیوں پہلے سے رد کر چکے

ہیں اور اس کا نام سننے کے لیے بھی تیار نہیں۔ دوسرے مذہب عام طور پر ان عقائد و نظریات کو کہا جاتا ہے جو منزل من السماء ہوں اور کسی بالاتر ہستی (اللہ) کی طرف سے آئیں۔ جہاں تک انسان کے اپنے سوچے اور تشکیل دیے گئے نظریات کا تعلق ہے، خواہ ساری دنیا انہیں مقدس سمجھے اور ان پر عمل کرے، انہیں بہر حال مذہب نہیں کہا جاسکتا۔ تو حاصل یہ کہ جن معنوں میں ہم مسلمان 'دین' کا لفظ استعمال کرتے ہیں (یعنی محض عبادات نہیں بلکہ نظام زندگی بھی) تو ان معنوں میں مغرب کا دین ہے ان کا ورلڈ ویو یعنی سیکولرزم، ہیومنزم وغیرہ۔ اور جیسا کہ ہم سطور بالا میں دیکھ چکے ہیں کہ ہیومنزم، لبرلزم، سیکولرزم اور امپریسزم...... وغیرہ کا مطلب ہے خدا، رسول اور آخرت کی نفی اور ان کی بنیاد پر جو تعلیمی، تہذیبی، معاشرتی اور قانونی ڈھانچہ بنتا ہے اس کا مطلب ہے اسلامی افکار واقدار کا خاتمہ۔ پس ثابت ہو گیا کہ اسلامی اور مغربی تہذیب کی فکری اور عملی اساسات ایک دوسرے سے مختلف بلکہ باہم متضاد ہیں۔

کتابیات

اپنے استدلال کو آگے بڑھانے سے پہلے ایک ضمنی معاملہ جو نہایت اہم ہے۔ یہ بات کہ مغربی تہذیب کی اساس سیکولرزم، ہیومنزم، لبرلزم، امپریسزم...... وغیرہ پر ہے جو توحید، رسالت اور آخرت کی نفی کرتے ہیں اور اسلامی فکر و تہذیب و اقدار کے نقیض ہیں، ایک مستحکم علمی بنیاد رکھتی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں چونکہ مطالعۂ مغرب کی روایت مستحکم نہیں اور تعلیمی نظام غلط ہے اس لیے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی اس بات سے بخوبی واقف نہیں ہیں۔ لیکن یہ کوئی خالص تحقیقی اور تفصیلی تحریر نہیں ہے کہ ہم یہاں مغربی کتب کے حوالہ جات اور اقتباسات سے اس موقف کو تفصیل سے ثابت کریں۔ اس کا حل ہم نے یہ سوچا ہے کہ ہم یہاں ان چیدہ کتابوں کی ایک فہرست مرتب کر دیں جن سے مغربی فکر و تہذیب کے تصورات و نظریات کا پتہ چل سکتا ہے اور اسلامی نظریے سے ان کا مختلف اور متضاد ہونا واضح ہوتا ہے تاکہ جو قارئین اس موقف کا تفصیلی علمی مطالعہ کرنا چاہیں وہ ان کتابوں سے رجوع کر لیں:

اردو کتابیات

۱۔ ول ڈیورانٹ، داستان فلسفہ (ترجمہ عابد علی عابد) فکشن ہاؤس، لاہور ۱۹۹۵ء
۲۔ ولیم جیمز اور ول ڈیورانٹ، نشاط فلسفہ (اردو ترجمہ محمد اجمل) فکشن ہاؤس، لاہور ۱۹۹۵ء
۳۔ سی جے کلیمنٹ، تاریخ فلسفہ (اردو ترجمہ مولوی احسان احمد) جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد دکن، ۱۹۲۹ء
۴۔ ہیرالڈ ہوفڈنگ، فلسفۂ جدید (ترجمہ خلیفہ عبدالحکیم)، جامعہ عثمانیہ، ۱۹۳۱ء
۵۔ ڈی ایس رابنسن، مقدمۂ فلسفۂ حاضرہ (ترجمہ ڈاکٹر میر ولی الدین) اشاعت نو، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۵ء
۶۔ سی ایم جوڈ، تعارف فلسفۂ جدید (اردو ترجمہ آشکار حسین)، مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۵۶ء
۷۔ خواجہ غلام صادق، فلسفۂ جدید کے خدوخال، نگارشات، لاہور ۱۹۸۶ء
۸۔ پروفیسر سیموئیل ھنٹنگٹن، تہذیبوں کا تصادم (اردو ترجمہ و تلخیص) نگارشات، لاہور ۲۰۰۵ء
۹۔ پروفیسر سی اے قادر، فلسفۂ جدید اور اس کے دبستان، مغربی پاکستان اردو اکیڈیمی، لاہور، ۱۹۸۱ء
۱۰۔ ڈاکٹر وحید عشرت، فلسفہ کیا ہے؟ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۸۷ء
۱۱۔ قاضی قیصر الاسلام، فلسفے کے بنیادی مسائل نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد ۱۹۹۶ء
۱۲۔ علی عباس جلالپوری، روایات فلسفہ، المثال، لاہور ۱۹۶۹ء
۱۳۔ آلیور تھیچر و فرڈی نینڈ شیول، تاریخ یورپ (اردو ترجمہ عبدالماجد دریا بادی و دیگر) تخلیقات لاہور، ۲۰۰۳ء

۱۴۔ جان ولیم ڈریپر، معرکۂ مذہب وسائنس (اردو ترجمہ مولانا ظفر علی خاں) انجمن اردو، حیدر آباد (دکن) س، ن
۱۵۔ ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری، مغربی تہذیب۔ ایک معاصرانہ تجزیہ، شیخ زاید اسلامک سنٹر، جامعہ پنجاب، لاہور ۲۰۰۲ء
۱۶۔ محمد حسن عسکری، جدیدیت یا مغربی گمراہیوں کی تاریخ کا خاکہ، راولپنڈی ۱۹۷۹ء
۱۷۔ آغا افتخار حسین، فکر فرنگ، نفیس اکیڈمی، حیدر آباد ۱۹۴۶ء
۱۸۔ ڈاکٹر رفیع الدین، قرآن اور علم جدید، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۵۲ء
۱۹۔ مولانا مودودی، تنقیحات، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۳ء
۲۰۔ مولانا امین احسن اصلاحی، فلسفے کے بنیادی مسائل۔ قرآن حکیم کی روشنی میں، فاران فاؤنڈیشن، لاہور ۱۹۹۷ء
۲۱۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق، یورپ پر اسلام کے احسان، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور ۱۹۷۵ء
۲۲۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق، اسلام اور عصر رواں، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، س ن
۲۳۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق، الحاد مغرب اور ہم، مکتبہ جدید پریس، لاہور ۱۹۷۸ء
۲۴۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق، ہماری عظیم تہذیب، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور ۱۹۸۱ء
۲۵۔ مولانا وحید الدین خاں، اسلام عصر حاضر میں، المکتبہ الاشرفیہ، لاہور، س ن
۲۶۔ سید قطب، ساجد الرحمٰن صدیقی، اسلام اور مغرب کے تہذیبی مسائل، ادارہ معارف اسلامی، کراچی ۱۹۷۳ء
۲۷۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، مجلس نشریات اسلام، کراچی ۱۹۷۶ء
۲۸۔ سید ابوالحسن علی ندوی، مسلم معاشرے میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، مجلس مجلس نشریات اسلام، کراچی ۱۹۷۶ء

۲۹۔ ڈاکٹر محمد امین، مسلم نشأۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل، کتاب سرائے اردو بازار، لاہور ۲۰۰۴ء

۳۰۔ ڈاکٹر محمد امین، اسلام اور تزکیۂ نفس۔ مغربی نفسیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ، اردو سائنس بورڈ، لاہور ۲۰۰۴ء

۳۱۔ پروفیسر رب نواز، اسلامی کلچر اور اس کا مادی و روحانی کلچر سے تقابلی جائزہ، حجاز پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۲ء

۳۲۔ ڈاکٹر احسان محمد خان، مشرقی و مغربی تہذیب، اکیڈیمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی ۱۹۶۲ء

۳۳۔ سید اقبال احمد جونپوری، قوموں کا عروج و زوال۔ مذاہب کی روشنی میں، شیراز پبلشنگ ہاؤس، جونپور، بھارت ۱۹۶۲ء

۳۴۔ پروفیسر عبدالحمید صدیقی، انسانیت کی تعمیر نو اور اسلام، اسلامک پبلشنگ ہاؤس لاہور، ۱۹۳۶ء

۳۵۔ محمد قطب، اسلام اور جدید ذہن کے شبہات، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور

۳۶۔ محمد قطب، اسلام اور جدید مادی افکار (اردو ترجمہ سجاد احمد) مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی ۱۹۹۰ء

۳۷۔ محمد قطب، جدید جاہلیت (اردو ترجمہ ساجد الرحمٰن صدیقی) اسلامک بک پبلشرز، کویت ۱۹۷۶ء

۳۸۔ ڈاکٹر محمد مظہر الدین صدیقی، ہیگل، مارکس اور اسلامی نظام، پٹھان کوٹ ۱۹۴۳ء

۳۹۔ ڈاکٹر محمد مظہر الدین صدیقی، اسلام اور مذاہب عالم، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور ۱۹۸۶ء

۴۰۔ قاری محمد طیب، اسلام اور مغربی تہذیب، ادارہ تاج المعارف، دیوبند، ۱۹۵۸ء

۴۱۔ محمد ارشد خان بھٹی، مطالعۂ تہذیب اسلامی، بک ورلڈ، لاہور، س ن

۴۲۔ علامہ ڈاکٹر محمد اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ (اردو ترجمہ سید نذیر نیازی)، کاروان پریس، لاہور ۱۹۵۸ء
۴۳۔ جسٹس محمد منیر، اسلام اور تہذیب حاضرہ، لاء پبلشنگ کمپنی، لاہور، س ن
۴۴۔ ظفر تاباں، مقابلۂ اسلام و یورپ، انجمن ترقی اردو، دہلی ۱۹۲۷ء
۴۵۔ مولانا تقی امینی' لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر' دارالمصنفین ' اعظم گڑھ' ۱۹۶۵ء
۴۶۔ قاضی جاوید، معاصر مغربی فلاسفہ، نگارشات، لاہور، س ن
۴۷۔ پال فنڈلے، امریکہ کی اسلام دشمنی، نگارشات، لاہور ۲۰۰۳ء
۴۸۔ مسرت کریم، معاشرے پر مغربی تہذیب کے مضر اثرات (تھیسز ایم اے، شعبہ علوم اسلامیہ) جامعہ پنجاب ۱۹۸۷ء
۴۹۔ سید حسین نصر، جدید دنیا میں روایتی اسلام، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۶ء
۵۰۔ راجہ عبدالرحمٰن، جدید تہذیب اور اسلام کی روشنی، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور ۱۹۹۵ء
۵۱۔ پروفیسر عزیز احمد، برصغیر میں اسلامی جدیدیت (ترجمہ ڈاکٹر جمیل جالبی) ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور ۱۹۹۷ء
۵۲۔ خالد جامعی و عمر حمید ہاشمی، جریدہ ۲۹، شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی، ۲۰۰۴ء
۵۳۔ ماہنامہ ساحل، کراچی (اکثر شمارے)

انگریزی کتابیات

1- G.R.Elton, *Renaissance and Reformation*, 1300-1648, The Mecmillan Co. New York, 1968.

2- Kurts Paul, *Forbidden Fruit: The Ethics of Humanism* (Tr. Philip Mairet). Routledge, London, 1997.

3- Summervile John, *The Secularization of Early Modern England*, Oxford University Press, 1992.

4- W.F. Reddawa, *A History of Europe from 1161 to 1715*, Methven & Co. Ltd. London, 1959.

5- A. J. Grant & H. Temperley, *Europe in the 19th & 20th Centuries (1798-1938)*, Longmans, Green & Co. London, 1939.

6- T.K. Derry & T. L. Jarman, *The European World (1870-1961)*, G. Bell & Sons Ltd. London, 1968.

7- S.E. Frost, *The Basic Teachings of Great Philosophers*, New Home Library, 1942.

8- Well Durant, *The Story of Philosophy*, Ernest Benn, 1947

9- Eugene G. Bewkes & Others, *The Western Heritage of Faith and Reason*, Harper & Row Publishers, London 1963.

10- Carlton, J. H. Hayes, *A Political & Cultural History of Europe*, 2 Vols, The Macmillan Co. New York. 1935.

11- Sterling P. Luprecht. *Our Philosophical Traditions*, Appleton-Century-Crofts Inc. New York, 1955.

12- Andrew Cheywood, *Political Ideas and Concepts- An Intoduction*, McMillan, Hampshire, 1994.

13- Dobxhausky, Theodozus, *Mankind Evolving*, Yales University press, 1962.

14- F. Copleston, *A History of Philosophy*, Image Books, New York, 1961.

15- Draper, J.K. *A History of the Intellectual Development of Europe*, London, 1891.

16- Paul Fundley, *Silent No More: Confronting America`s False Images of Islam*, New York, 2004.

17- Noam Chomsky, *The New Military Humanism*, London, 1999.

18- John L. Esposito, *The Islamic Threat: Myth or Reality!* London, 1995.

19- John L. Esposito, World Religions Today, Oxford University Press, 2002

20- Ernest Gellener, *Postmodernism, Reason and Religion*, New York, 1992.

21- Ernest Gellener, *Islamic Dilemmas, Reforms, Nationalists and Industrialists*, Walter de Gruyter, 1985.

22- Bernard Lewis, *Crises of Islam: The Holy War and Unholy Terror,* Oxford University Press, 2002

23- Martin Kramer, *Arab Awakening and Islamic Revival*, Transaction Publishers, New Jersey, 1996.

24- Moıvin E. Gettleman and Stuart Schear, *The Middle East and Islamic World Reorder*, Grove Press, 841 Broadway New York, 2003.

25 S.N. Eisenstadl, *Fundamentalism, Secretarianism and Revolutions*, Cambridge University Press, 1999.

26. Ceasar E. Farah, *Islam,* Barran's Educational Sciences Inc. New York, 2003.

27- Karen Armstrong, *Muhammad:A Western Attempt to Understand Islam*, Victor Hollancz, London, 1992.

28. Cragg Kenneth, *Call of Minaret*, Oxford University Press, New Yrok, 1956.

29- Morman Daniel, *Islam and the West: The Making of an*

Image, Oxford, 1960.

30- Albert Hourani, *Western Attitudes towards Islam,* Univesity of South Hampton,1974.

31- Albert Hourani, *Islam in European Thought*, Cambridge University8 Press, 1989.

32- R.W. Southern, *Western Views of Islam in Middle Ages,* Harvard University Press, 1962.

33- Montgomery Watt, *Islamic Fundamentalism and Modernity*, Ken Paul, London, 1988.

34- Will Wagner, *How Islam Plans to Change the World,* Kregel Publication, USA 2004.

35- Barry Rubin, *Revolutioneries and Reforms: Contemporary Islamist Movements in the Middle East,* Univerity of Ne Yorl Press, 2003

36- Ziauddin Sardar, *The Furure of Muslim Civilzation,* Groom Helm, London, 1979.

37- Ziauddin Sardar, *Islamic Futures*, Peland Publications, Malaysia, 1988.

38- Muhammad Asad, *Islam at the Cross Road*, Sh. Muhammad Ashraf, Lahore, 1985.

39- Fazlur Rehman, *Islam and Modernity: Transformation of an Intellectual Tradition*, Chicago, 1982.

40- Anwar Ibrahim, *The Asian Renaissance,* Kuala Lumpur, 1996.

41- Akbar S. Ahmad & Hastings Donnan (Eds.), *Islam, Globalization and Postmodernity*, London, 1994.

42. Akbar S. Ahmad, *Postmodernism and Islam: Predicament and Promise*, London, 1992.

43- Iftikhar H. Malik, *Islam, Globalisation and Modernity*, Vanguard. Lahore, 2004.

۴۔ قرآن وسنت کی تعلیمات کہ یہود ونصاریٰ مسلمانوں کے دشمن ہیں

یہاں ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے اور وہ مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے بہت اہم ہے اور وہ یہ کہ یہود ونصاریٰ کے بارے میں قرآن وسنت نے مسلمانوں کو کچھ واضح ہدایات دی ہیں اور ظاہر ہے کہ انسانوں کی سوچ، علم اور دانش سب میں غلطی کا امکان ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا کلام اور اس کے رسول کی سنت، بہر حال برحق ہے اور وہ صرف اور صرف سچ پر مبنی ہے۔ آیئے دیکھیں قرآن وسنت اس بارے میں مسلمانوں کی کیا رہنمائی فرماتے ہیں:

یہود ونصاریٰ سے دوستی نہ کرو

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَاتَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰى اَوْلِيَآءَ ﴾ [المائدہ:۵:۵۱]

اے ایمان والو! یہودیوں اور عیسائیوں کو دوست نہ بناؤ۔

وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں، تمہارے نہیں

﴿ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ﴾ [المائدہ: ۵:۵۱]

''وہ (صرف) ایک دوسرے کے دوست ہیں۔''

جو ان سے دوستی کرے وہ انہی میں سے ہے

﴿ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ﴾ [المائدہ: ۵: ۵۱]

''تم میں سے جو انہیں اپنا دوست بنائے گا وہ انہی میں شمار ہوگا۔''

جو ان سے دوستی کرے وہ ظالم ہے اور ہدایت الٰہی سے محروم

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ [المائدہ: ۵: ۵۱]

''بے شک اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

چھٹی صدی ہجری کے عظیم اندلسی عالم، فقیہ، محدث اور معروف ''کتاب الشفاء'' کے مؤلف قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''مصباح الارواح فی اصول الفلاح'' میں

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے ان مسلمانوں کی تکفیر کی ہے جو یہودیوں کے ساتھ دوستی کا تعلق رکھیں اور ان کی حمایت کریں۔[1]

یہودی اور مشرک عیسائیوں سے بھی بڑھ کر مسلمانوں کے دشمن ہیں

﴿لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا﴾

[المائدہ: ۵: ۸۲]

''ایمان والوں کے ساتھ دشمنی میں تم سب سے بڑھ کر یہودیوں اور مشرکوں کو پاؤ گے۔''

[جب کہ آج یہودی، عیسائی اور ہندو (مشرک) سب مسلمانوں کے خلاف اکٹھے ہو کر گٹھ جوڑ کر چکے ہیں اور مل کر مسلمانوں کو ختم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔]

اہل کتاب اور کفار اسلام دشمن ہیں ان سے دوستی نہ کرو

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾

[المائدہ ۵: ۵۷]

''اے ایمان والو! اہل کتاب اور کافروں میں سے جن لوگوں نے تمہارے دین کو مذاق اور کھیل بنالیا ہے، انہیں اپنا دوست نہ بناؤ اور اللہ سے ڈرو اگر تم واقعی ایمان والے ہو۔''

ان کو راز دار نہ بناؤ

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ﴾ [آل عمران ۳:۱۱۸]

''اے ایمان والو! غیر مسلموں کو (یعنی یہودیوں اور عیسائیوں کو، کیونکہ سابقہ آیات میں انہی کا ذکر ہے) اپنا راز دار نہ بناؤ۔''

۱۔ بحوالہ Encyclopaedia of Islam, vol.10 P-122, Leiden, 2000

یہ تمہیں نقصان پہنچانا چاہتے ہیں

﴿ لَا يَالُونَكُمْ خَبَالًا ﴾ [آل عمران ۳:۱۱۸]

''وہ تمہیں نقصان پہنچانے میں کوئی کمی نہیں کرتے۔''

یہ تمہارے بدخواہ ہیں

﴿ وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ ﴾ [آل عمران ۳:۱۱۸]

''وہ چاہتے ہیں کہ تم مشکل میں پڑو۔''

ان کی مسلم دشمنی ان کے ظاہر سے بھی نمایاں ہے

﴿ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ﴾ [آل عمران ۳:۱۱۸]

''ان کی دشمنی ان کی باتوں سے ظاہر ہے۔''

اوران کے دلوں میں تو تمہارے خلاف زہر بھرا ہوا ہے

﴿ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ اَكْبَرُ ﴾ [ال عمران ۳: ۱۱۸]

''اور جو بغض ان کے دلوں میں ہے وہ اس سے بھی زیادہ ہے۔''

وہ تمہارے دوست نہیں ہیں

﴿ هَا اَنْتُمْ اُولَاءِ تُحِبُّونَهُمْ وَلَا يُحِبُّونَكُمْ ﴾ [آل عمران ۳:۱۱۹]

''تم ان سے دوستی رکھتے ہو مگر وہ تم سے دوستی نہیں رکھتے۔''

وہ تمہارے خلاف غصے، نفرت اور انتقام سے بھرے بیٹھے ہیں

﴿ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ﴾ [آل عمران ۳:۱۱۹]

''جب وہ تم سے الگ ہو کر آپس میں ملتے ہیں تو تمہارے خلاف غصے سے اپنی انگلیاں چباتے ہیں۔''

تمہاری خوشی وخوشحالی سے انہیں تکلیف ہوتی ہے

﴿ اِنۡ تَمۡسَسۡكُمۡ حَسَنَةٌ تَسُؤۡهُمۡ ﴾ [آل عمران ۳:۱۲۰]

''اگر تمہارے حالات اچھے ہوں تو انہیں رنج ہوتا ہے۔''

اور تمہاری تکلیف سے وہ خوش ہوتے ہیں

﴿ وَاِنۡ تُصِبۡكُمۡ سَيِّئَةٌ يَّفۡرَحُوۡا بِهَا ﴾ [آل عمران ۳:۱۲۰]

''اگر تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ اس سے خوش ہوتے ہیں۔''

ان کا مقابلہ تم صبر اور تقویٰ ہی سے کر سکتے ہو

﴿ وَاِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَتَتَّقُوۡا لَا يَضُرُّكُمۡ كَيۡدُهُمۡ شَيۡـًٔا ﴾ [آل عمران ۳:۱۲۰]

''اگر تم صبر سے کام لو اور تقوی اختیار کرو تو ان کی سازشیں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی۔''

کفار سے دوستی نہ کرو

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوا الۡكٰفِرِيۡنَ اَوۡلِيَآءَ مِنۡ دُوۡنِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اَتُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ تَجۡعَلُوۡا لِلّٰهِ عَلَيۡكُمۡ سُلۡطٰنًا مُّبِيۡنًا ﴾ [النساء۴: ۱۴۴]

''اے ایمان والو! مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے خلاف اللہ کی کھلی حجت قائم کرالو۔''

یہی عقل ودانش پر مبنی رویہ ہے

﴿ قَدۡ بَيَّنَّا لَكُمُ الۡاٰيٰتِ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ﴾ [آل عمران ۳:۱۱۸]

''اگر تم عقل رکھتے ہو تو ہم نے تمہارے لیے تمام نشانیاں واضح کر دی ہیں۔''

[کافر یعنی اسلام کا انکار کرنے والے دو بڑے گروپ ہیں ایک مشرک جو اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں اور پیغمبر کو بھی نہیں مانتے۔ دوسرے اہل کتاب جو اللہ کو تو مانتے ہیں لیکن اس کے بعض پیغمبروں کو مانتے ہیں اور بعض (خصوصاً آخری نبی

حضرت محمد ﷺ) کو نہیں مانتے۔]

کافر باپ اور بھائی سے بھی دوستی نہ کرو

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴾

[التوبۃ ۹: ۲۳]

''اے ایمان والو! اپنے باپوں اور بھائیوں کو دوست نہ بناؤ اگر وہ ایمان کے مقابلے میں کفر کو عزیز رکھیں۔ اور تم میں سے جو انہیں اپنا دوست بنائیں گے تو ایسے لوگ ہی ظالم ہیں۔''

مطلب یہ کہ جو بھی دین اسلام کا انکار کرے خواہ وہ تمہارا باپ اور بھائی ہی ہو یا اہل کتاب ہوں یا مشرک ہوں ان سے دوستی نہ رکھو اور اگر تم ایسا کرو گے تو غلط کرو گے، خود اپنے ساتھ ظلم کرو گے۔]

یہودیوں سے دوستی رکھنے والے کا ایمان قبول نہیں

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَي الْكٰفِرِيْنَ ۡ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَاۗىِٕمٍ ۭ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ۝ وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝ ﴾ [المائدۃ: ۵۴-۵۶]

''اے ایمان والو! تم میں سے جو شخص اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ کو کوئی پروا نہیں۔ وہ اور ایسے لوگ پیدا کر دے گا جو اللہ کو محبوب ہوں گے اور اللہ انہیں محبوب ہو گا۔ وہ مسلمانوں کے لیے نرم اور کافروں کے مقابلے میں سخت ہوں گے۔ وہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں

ڈریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ اور اللہ وسعت والا اور علم والا ہے۔ اے مسلمانو! تمہارا دوست اللہ ہے، اس کا رسول ہے اور وہ ایمان والے تمہارے دوست ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں۔ اور جو شخص اللہ، اس کے رسولؐ اور ایمان والوں کو دوست بنائے تو وہ اللہ کی جماعت ہے جو غالب رہنے والی ہے۔''

[یہ آیات جنگ احزاب کے بعد نازل ہوئیں اور ان میں اُن منافقین کے ایمان کو رد کیا گیا ہے جو اُن یہودیوں کے ساتھ حلیفانہ اور دوستی کے تعلقات برقرار رکھنا چاہتے تھے جنہوں نے مشرکین مکہ کو مسلمانوں کے خلاف جنگ پر اکسایا اور مدینہ کے محاصرے میں ان کا ساتھ دیا تھا۔] [1]

یہود ونصاریٰ چاہتے ہیں کہ تم بے دین ہو جاؤ

﴿ وَلَنۡ تَرۡضٰی عَنۡکَ الۡیَهُوۡدُ وَلَا النَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمۡ ﴾

[البقرۃ۲: ۱۲۰]

''یہودی اور عیسائی اس وقت تک تم سے راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کا مذہب اختیار نہ کرلو۔''

اللہ کا راستہ ہدایت کا راستہ ہے، ان کا نہیں

﴿ قُلۡ اِنَّ هُدَی اللّٰهِ هُوَ الۡهُدٰی ﴾ [البقرۃ۲: ۱۲۰]

''ان سے کہو کہ اللہ کی ہدایت ہی سچی ہدایت ہے۔''

یہود ونصاریٰ کی پیروی اللہ کی ناراضی کا سبب

﴿ وَلَئِنِ اتَّبَعۡتَ اَهۡوَآءَهُمۡ الَّذِیۡ جَآءَکَ مِنَ الۡعِلۡمِ مَا لَکَ مِنَ اللّٰهِ مِنۡ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیۡرٍ ﴾ [البقرۃ۲: ۱۲۰]

۱۔ محمد شدید: منہج القرآن فی التربیۃ، ص:۲۶۱، مؤسسۃ الرسالۃ بیروت: ۱۹۸۷ء

"اور اگر تم اللہ کی طرف سے صحیح علم آ جانے کے بعد بھی ان کی خواہشوں کے پیچھے چلو گے تو اللہ کے مقابلے میں تمہارا نہ کوئی حمایتی ہو گا اور نہ کوئی مددگار۔"

سنت سے استدلال

نبی کریم ﷺ کے بہت سے فرمودات سے بھی اس قرآنی نقطۂ نظر کی تائید ہوتی ہے بلکہ مختلف واقعات کے تتبع سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کا یہ مستقل مسلک تھا کہ یہود و نصاریٰ کے رویے کی وجہ سے ان کے ساتھ ہم آہنگی اختیار نہ کی جائے بلکہ ان کی ہمیشہ مخالفت کی جائے تاکہ مسلمانوں کی اپنی مستقل حیثیت اور انفرادیت کا اظہار رہو اور یہ پختہ ہو جائے، چنانچہ بہت سی احادیث شروع ہی اس جملے سے ہوتی ہیں کہ "خالفوا الیهود والنصاری" (۱) چند ایک واقعات بطور مثال پیش خدمت ہیں:

- مدینہ میں یہودیوں میں رواج تھا کہ حیض کے دنوں میں عورت کا مکمل بائیکاٹ کر دیتے تھے اور گھر میں اس سے بول چال، اٹھنا بیٹھنا اور لینا دینا بھی بند کر دیا جاتا تھا۔ آپ ﷺ کے علم میں یہ بات لائی گئی تو فرمایا یہ غلط ہے صرف جنسی فعل منع ہے۔ باقی سارے معاملات نارمل انداز سے بجالاؤ اور عورتوں کو اچھوت نہ بناؤ۔ (۲)

- یہودی بڑھاپے میں داڑھی اور سر کے سفید بال نہیں رنگتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا یہود کی مخالفت کرو اور اپنے بال رنگا کرو۔ (۳)

- مکہ میں یہ ممکن تھا کہ نماز اس طرح ادا کی جائے کہ کعبہ اور بیت المقدس دونوں سامنے ہوں لیکن مدینہ میں یہ صورت ممکن نہ رہی۔ یہود کا قبلہ چونکہ بیت المقدس تھا لہٰذا آنحضرت ﷺ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس نہ ہو بلکہ کعبۂ مشرفہ ہو۔

۱۔ مسند احمد بن حنبل، ج ۵، ص ۲۶۴، ۲۶۵

۲۔ صحیح مسلم، کتاب الحیض، باب جواز غسل الحائض

۳۔ صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب من ذکر عن بنی اسرائیل

آپ ﷺ نے اس کے لیے بہت دعائیں کیں اور مضطرب رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے لیے کعبہ کو قبلہ مقرر فرما دیا۔ (۱)

- مسلمان دس محرم کو عاشورہ کا روزہ رکھتے تھے۔ جب مدینہ میں آپ ﷺ نے دس محرم کو روزہ رکھنے کا حکم دیا تو انصار نے کہا کہ یہودی اس یوم کو متبرک مان کر روزہ رکھتے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہم اگلے سال ۹ محرم کو روزہ رکھیں گے۔ (۲) اور دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا کہ میں اگلے سال تک زندہ رہا تو ۹ محرم کا روزہ رکھوں گا۔ (۳)

- سورۃ فاتحہ کے آخر میں ''غیر المغضوب علیھم و لاالضالین'' کے الفاظ آتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ دعا سکھائی ہے (اور وہ نماز کی ہر رکعت میں یہ دعا مانگتے ہیں) کہ اے اللہ! ہمیں ان لوگوں کے راستے پر نہ چلا جن پر تیرا غضب ہوا اور جو گمراہ ہوئے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مغضوب اور ضالین سے مراد یہاں یہود و نصاریٰ ہیں۔ (۴)

- نبی کریم ﷺ نے فرمایا "لا تستضیئوا بنار المشرکین" (۵) یعنی غیر مسلموں کی آگ سے آگ نہ جلاؤ۔ مطلب یہ کہ ان سے معاشرتی تعلقات نہ رکھو، ان کے قریب نہ رہو، ان سے لینا دینا نہ رکھو، ان کی محتاجی سے بچو، اپنی ضروریات میں خود کفیل رہو وغیرہ اور امام حسن بصری سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اپنے امور میں ان سے مشاورت نہ کرو۔ (۶)

۱۔ صحیح بخاری، کتاب الصلاۃ، باب التوجہ نحو القبلۃ حیث کان

۲۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصیام، باب ماروی ان عاشوراء الیوم التاسع

۳۔ مسند احمد بن حنبل ج ۱ ص ۲۳۶

۴۔ سنن ترمذی، ابواب تفسیر القرآن، باب ومن سورۃ فاتحۃ الکتاب۔

۵۔ سنن نسائی، کتاب الزینۃ، باب لاتنقشوا علی خواتیمکم عربیاً

۶۔ امام ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ج ۱ ص ۳۹۸، سہیل اکیڈمی لاہور، ۱۹۷۲ء

- حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایک دفعہ کہیں سے تورات مل گئی تو آپ نے اس کا مطالعہ شروع کر دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت ناگوار گزرا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فوراً معذرت کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر آج موسیٰ علیہ السلام خود بھی ہوتے تو انہیں میری پیروی کے سوا چارہ نہ ہوتا۔[۱]

- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تربیت اور ان احکام کا اثر یہ ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام کو کتابیہ عورتوں سے شادی سے منع کر دیا اور جب آپ اپنے عہد حکومت میں شام کے دورے پر گئے تو آپ کے سامنے اہل کتاب میں سے حیرہ کے ایک ذہین اور تجربہ کار نوجوان کو پیش کیا گیا کہ آپ چاہیں تو اسے کاتب (چیف سیکرٹری سے ملتا جلتا ایک عہدہ) رکھ لیں لیکن آپ نے ناپسند کیا بلکہ آپ نے حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ گورنر بصرہ کو سختی سے حکم دیا کہ اپنے نصرانی کاتب کو ہٹا دیں۔[۲]

یاد رہے کہ مسلمانوں نے جب ان علاقوں کو فتح کیا تو مقامی حکومتی مشینری (بیوروکریسی) کو مصلحتاً نہ بدلا اور نظام وہی چلاتے رہے۔ بعد میں اموی خلیفہ عبدالملک نے عربی کو سرکاری زبان قرار دیا اور سارا ریکارڈ عربی میں منتقل کیا گیا اور بیوروکریسی میں بھی تبدیلی آئی۔

قرآن حکیم کی ان آیات اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان احادیث کے تتبع سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمیں اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود و نصاریٰ کی دوستی سے منع کیا ہے اور واضح لفظوں میں ہمیں یہ بتایا ہے کہ وہ ہمارے دشمن ہیں، خیرخواہ نہیں اور وہ ہمیں دین و دنیا میں ناکام بنانا چاہتے ہیں اور نہ صرف یہ بلکہ یہ دھمکی بھی دی ہے کہ اگر اس کے باوجود ہم ان کے ساتھ دوستی رکھیں گے تو ہمارا شمار انہی کے ساتھ ہوگا اور ہم دنیا و آخرت میں اللہ کے عذاب اور ناراضی سے بچ نہ سکیں گے۔

۱۔ سنن دارمی، مقدمہ، باب ۳۹

۲۔ تفسیر ابن کثیر، ج ۲ ص ۶۸

۵۔ اہل مغرب کا روّیہ مسلمانوں کے ساتھ عملاً دشمنی کا ہے

اسلام اور اہل مغرب کی فکری اساسات اور ان کے بنیادی عقائد کے مطالعے کے بعد جو چیز اہم ہے وہ فریقین کا باہمی رویہ ہے کیونکہ مسلمان اپنی کمزوری اور دیگر اسباب کی بنا پر اہل مغرب کے ساتھ دوستی اور مفاہمت کا رویہ رکھنا بھی چاہیں لیکن اہل مغرب کا رویہ ان کے ساتھ دشمنی اور انتقام کا ہو تو ظاہر ہے یہ دوستی پروان نہیں چڑھ سکتی کیونکہ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ لہٰذا آیئے دیکھیں کہ اہل مغرب کا رویہ مسلمانوں کے ساتھ کیسا رہا ہے؟

موجودہ مغربی تہذیب کی ابتدا اور تشکیل ہی اسلام دشمن جذبات سے ہوئی۔ اس کی بیداری کی بنیاد ہی اسلام اور مسلمانوں سے انتقام لینے پر تھی۔ چنانچہ جوں ہی اہل مغرب ذرا سنبھلے، انہوں نے صلیبی جنگیں چھیڑ دیں لیکن مسلمانوں نے ان کے دانت کھٹے کر دیے۔ اب ان کے مسلم دشمن جذبات میں اور زیادہ شدت پیدا ہوگئی۔ ذرا بیسویں صدی سے پہلے کا مغربی لٹریچر اٹھا کر دیکھیے کہ انہوں نے اسلام، پیغمبر اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں کیا لکھا ہے؟ کیا آپ یقین کریں گے کہ اس میں مسلمانوں کو جاہل، گنوار، وحشی اور ملحد گردانا گیا ہے جو اپنے نبی کی پرستش کرتے ہیں۔[1] نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ زندگی پر ایسے گھناؤنے اخلاقی اور جنسی الزامات لگائے گئے کہ انہیں حوالے کے لیے بھی نقل نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے بغض و عناد کی انتہا یہ تھی کہ حضور ﷺ کا اسم گرامی کئی کئی طرح سے بگاڑ کر لکھا جاتا تھا اور قرآن کو آنحضرتؐ کی تصنیف کہا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ بیسویں صدی کے بعض سنجیدہ مغربی سیرت نگاروں کو اس پر باقاعدہ معذرت کرنا پڑی اور شرمندگی کا اظہار کرنا پڑا۔[2]

۱۔ دیکھیے فرانسیسی مصنف Willeh Alm کی تصنیف Wolfram von Eschenbuck بحوالہ لائیڈن انسائیکلو پیڈیا آف اسلام در مقالہ محمد [ﷺ] ج ۷ ص ۳۶۰ و مابعد، طبع ۱۹۹۳ء

۲۔ دیکھیے Godfrey Higgins کی کتاب An Apology for the Life and Character of the Celebrated Prophet of Arabia Called Mohammad, the Illustrious, 1829 اور Lofty Levonian کی کتاب Studies in Relatioship between Islam and Christianity لندن، ۱۹۴۰ء۔

پھر جب وہ ذرا طاقت ور ہوئے تو انہوں نے مسلمانوں کے خلاف سازشوں کا جال پھیلایا، عربوں کو ترکی کی مرکزی حکومت کے خلاف بھڑکایا، ان کا نظام خلافت ختم کروایا، مسلمانوں کی مختلف ریاستوں کو ایک دوسرے سے لڑایا، شروع شروع میں ان سے تجارتی مراعات لیں اور آہستہ آہستہ پیر پھیلا کر انڈسٹریل اسٹیٹس بنائیں، ان کے لیے حفاظتی گارڈز رکھنے کے نام پر پرائیویٹ فوج بنائی، رشوت اور پیسے دے کر مسلمان جرنیلوں کو خریدا اور باغیرت مسلمان حکمرانوں کے خلاف لڑائیاں لڑیں۔ اس طرح سازشوں سے، مکروفریب سے، جعل سازی سے، رشوت و بے ایمانی سے انہوں نے مسلمان حکومتوں کو کمزور کیا، انہیں شکست دی، ان کے ملکوں پر قبضہ کرلیا اور ان میں اتحاد ختم کر کے انہیں چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بانٹ دیا تاکہ نہ کبھی وہ متحد ہوں اور نہ کبھی ان کے لیے خطرہ بن سکیں۔

مسلمان ممالک پر قبضہ کر کے انہوں نے مسلمانوں کی معیشت کو اجاڑا، وہاں سے سارا خام مال اٹھا کر اپنے ممالک میں لے گئے اور اپنا صنعتی پہیہ چلایا اور وہی تیار شدہ مال انتہائی مہنگے داموں واپس انہی ممالک میں لا کر بیچا۔ انہوں نے اپنے ہاں صنعتی انقلاب برپا کیا اور ذرائع پیداوار کو ترقی دی جس کے لیے انہیں وسیع مارکیٹ کی ضرورت تھی اور یہ مقصد انہوں نے وسیع آبادی اور رقبے کے حامل مسلم ممالک پر قبضہ کر کے حاصل کیا۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے مسلم ممالک کے نظام تعلیم و تربیت کو ختم کیا اور اس کی جگہ اپنے نظریات کے مطابق اور اپنے مفادات کے لیے نیا تعلیمی نظام کھڑا کیا اور اس طرح انہوں نے محکوموں کی فکر اور ان کے اذہان وقلوب بدلے۔ ہندوستانی منتظم اور ماہر تعلیم لارڈ میکالے کی رپورٹ اس سلسلے میں ایک کلاسیک ماڈل کی حیثیت رکھتی ہے جس میں اس نے کہا تھا کہ ہم اپنے نظام تعلیم کے ذریعے ایسے مسلمان پیدا کریں گے جو نام کے تو شائد مسلمان ہی رہیں لیکن وہ ہماری فکر و تہذیب کے گن گائیں گے، ہمارے تمدن پر چلیں گے، ہماری حکومت میں ملازمتیں کریں گے اور گویا کالے

انگریز بن جائیں گے اور کم از کم ہندوستان میں ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ انگریز نے کامیابی سے ایسا کر کے عملاً دکھا دیا۔

پھر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ ان کے ہاں دو عظیم جنگیں ہوئیں جن میں یہ آپس میں لڑ پڑے۔ لاکھوں مرے اور کروڑوں اجڑے۔ اس سے استعمار کی ٹانگیں لڑکھڑا گئیں اور ادھر مسلمان مجاہدوں، مزاحمت کاروں اور سیاستدانوں نے انہیں زچ کر رکھا تھا چنانچہ مجبوراً انہیں مسلمان ممالک سے رخت سفر باندھنا پڑا۔ لیکن اس دو صدیوں کے قبضے میں مغربی استعمار کے شاطر ذہن نے یہ انتظام کر لیا تھا کہ اس کے جانے کے بعد مسلمان ممالک میں حکمران صرف وہی لوگ بنیں جو اس کے ذہنی غلام تھے، جو اس کی تہذیب کے رسیا تھے، جو اس کے تمدن کے قصیدہ خوان تھے۔ اس نے یہ اہتمام کیا کہ نظام تعلیم بڑی حد تک وہی رہے جو اس نے قائم کیا تھا اور ذرائع ابلاغ وہی نغمے الاپتے رہیں اور اسی راستے پر چلتے رہیں جو انہوں نے ان کے لیے تجویز کیے تھے۔ ہماری اور آپ کی آنکھیں یہ دیکھ رہی ہیں کہ یہ سب ایسے ہی ہوا۔

مغربی استعمار نے نہ صرف سیاسی لحاظ سے مسلمان ممالک کو مرغ دست آموز بنا کر رکھا بلکہ دور رہتے ہوئے بھی ان کی معیشت پر قبضہ کیا۔ اس کے لیے ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف جیسے ادارے قائم کیے، مسلمان ممالک کو قرضوں میں جکڑا، ان کو سود کے جال میں پھانسا اور ان کی معیشت کو تباہ کیا۔ حالت یہ ہے کہ کسی مسلمان ملک میں وزیر خارجہ اور وزیر مالیات مغرب و امریکہ کی مرضی کے خلاف مقرر نہیں ہو سکتا بلکہ اکثر و بیشتر یہ وزراء مغربی اداروں ہی سے آتے ہیں اور انہی کے تربیت یافتہ ہوتے ہیں اور مغرب کی پالیسیوں ہی پر عمل کرتے ہیں۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ اس میں مسلمانوں کا اور مسلمان حکمرانوں کا کوئی قصور نہیں۔ اصل قصور تو انہی کا ہے کہ بقول اقبالؒ۔

یورپ کی غلامی پہ رضا مند ہوا تو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

لیکن اس وقت ہم ذکر کر رہے ہیں عالم اسلام کے خلاف مغرب کی سازشوں کا، جن سے انکار ممکن نہیں۔ یہاں تک کہ ان کی کوششوں کے باوجود اگر کوئی مسلمان ملک کچھ تھوڑی بہت ترقی کر گیا جیسے ملائیشیا تو اس کی معیشت کو برباد کرنے کے لیے مالی بحران کھڑے کیے گئے۔ اور اگر کوئی ملک اچھا اسلحہ بنانے میں کامیاب ہوا تو اس کے خلاف محاذ کھول دیے گئے، خود مغرب (امریکہ) نے جاپان میں ایٹم بم گرایا اور لاکھوں انسان مار دیے۔ مغربی ممالک کے پاس ہزاروں ایٹم بم ہیں لیکن کسی مسلمان ملک کو یہ صلاحیت حاصل کرنے نہیں دی جاتی۔ پاکستان میں ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے کے جرم میں بھٹو کو پھانسی دی گئی، ضیاء الحق کو جہاز میں جلا دیا گیا، نواز شریف کو جلاوطن کروا دیا گیا اور قدیر خاں کو گلی گلی رسوا کر دیا گیا۔ یہ سب تو ہمارے آنکھوں دیکھے واقعات ہیں۔

ان ساری مغربی قدغنوں، کوششوں کے باوجود اگر کہیں ایسی حکومت قائم ہو گئی جو مغربی تہذیب کو رڈ کرے، اسلامی اقدار کو بلند اور نافذ کرنے کی کوشش کرے اور مغرب کے شکنجے میں آنے سے انکار کرے تو افغانستان کی طرح اس کا تورا بورا بنا دیا گیا اور اگر کوئی ذرا طاقت ور ہو جائے، اس کی معیشت و دفاع ذرا مستحکم ہو جائے اور وہ مغرب (وامریکہ) کا باج گزار بننے سے انکار کر دے تو اس کا حشر نشر کر دیا گیا جیسے کہ صدام اور عراق کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

اور ان کوششوں کو صدر امریکہ نے علی الاعلان صلیبی جنگ کہا (گو ڈپلومیسی اور منافقت سے بعد میں اس کی تردید کرنے کی کوشش کی)۔ اہل مغرب کا یہ بغض اور مسلمانوں سے نفرت اتنی عیاں اور نمایاں ہے کہ وہ چھپانے کی کوشش کرتے ہیں تو پھر بھی وہ چھپتی نہیں اور کہیں نہ کہیں سے ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ ان کی ذہنیت آج بھی وہی ہے جو پہلی جنگ عظیم میں انگریز جرنیل نے ظاہر کی تھی جب اس نے شام پر قبضے کے بعد دمشق میں صلاح الدین (رحمۃ اللہ علیہ) کی قبر کو ٹھڈے مارے تھے اور کہا تھا "اٹھو

صلاح الدین! ہم آ گئے ہیں۔'' اور ان کا آج بھی بس چلے تو وہ مسلمانوں کا وہی حشر کرتے ہیں جو انہوں نے ماضی میں کیا تھا جب انہوں نے مسلمانوں کا بیت المقدس میں اتنا خون بہایا تھا کہ گھوڑوں کے قدم اس میں ڈوب گئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے بوسنیا میں لاکھوں نہتے اور بے گناہ مسلمانوں کو تہ تیغ کیا، وہاں کوئی مسلمان عورت ایسی نہیں بچی جس کی عصمت دری انہوں نے نہ کی ہو۔ یہی کچھ افغانستان میں ہوا، یہی کچھ عراق میں ہو رہا ہے اور اگر چہ پاکستانی حکمران اس وقت مَیں مَیں کر کے اپنی جان بچا رہے ہیں لیکن بیچارا میمنا کب تک بدنیت بھیڑیے سے بچ سکتا ہے؟ گویا پاکستان کسی وقت بھی قتل گاہ بن سکتا ہے۔

اس موقف کو یوں بھی واضح کیا جا سکتا ہے کہ کمیونزم کے خاتمے کے بعد مغرب کا رویہ یہ ہے کہ 'انا ولا غیری' یعنی میں اس دنیا کا واحد خدا ہوں۔ ساری تہذیبوں اور ثقافتوں کو، سارے ادیان کو، ساری ریاستوں کو، خصوصاً مسلمانوں کو ہمارے آگے جھکنا چاہیے، جو گردن اکڑے گی وہ کاٹ دی جائے گی، افغانستان اور عراق کی طرح۔ جو ہمارا دوست اور باج گزار نہیں وہ ہمارا دشمن ہے اور ہم اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ اس کے ساتھ ہی:

- میڈیا کی بھرپور قوت کے ساتھ، سیٹلائٹس کے ذریعے، ریڈیو، ٹی وی، انٹرنیٹ، اخبارات، جرائد یعنی الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کی ساری قوت اس بات پر لگا دی گئی ہے کہ مسلمان مسلمان نہ رہیں۔
- مسلمانوں کے نظام تعلیم و تربیت کو بدلا جا رہا ہے۔ وہ پہلے ہی اسلامی تعلیمات اور تقاضوں کے مطابق نہ تھا تاہم اب مقصد یہ ہے کہ جو تھوڑی بہت اسلامیت بھی اس میں تھی، اسے نکال باہر کیا جائے اور اسے مغربی آدرشوں کا امین بنا دیا جائے۔ یہ کام زور و شور سے پاکستان اور دیگر مسلم ممالک میں شروع ہے۔
- مسلمان ممالک پر مغرب کے ایجنٹ آمر حکمران مسلط کیے جائیں خواہ وہ فوجی

ہوں، خواہ بادشاہ ہوں اور خواہ سیاست دان۔ بس شرط یہ ہے کہ وہ مسلمان عوام کی نہ مانیں، مغرب بہادر کے حکم پر چلیں، ورنہ چھٹی۔ مشرق بعید سے لے کر مشرق قریب، وسط ایشیا، شرق اوسط، افریقہ غرض جہاں جہاں مسلمان ممالک ہیں، اس اسکیم پر بہر صورت عمل کرایا جا رہا ہے۔

- آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک کے ذریعے مسلمان ممالک کی معاشی حالت تباہ کی جا چکی ہے، انہیں قرضوں میں جکڑا جا چکا ہے یہاں تک کہ غربت و افلاس کے ہاتھوں مسلمان ملکوں کے باشندے بھوک سے مر رہے ہیں اور خودکشیاں کر رہے ہیں۔ اس کے باوجود اب گلوبلائزیشن کے نام پر ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن (WTO) کے بین الاقوامی معاہدوں کے ذریعے مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کو دنیا بھر خصوصاً سارے مسلم ممالک پر مسلط کیا جا رہا ہے تاکہ ان کی مرضی کے بغیر تجارت وصنعت کا ایک پتا بھی نہ ہلے۔

ثقافتی ترقی، بنیادی حقوق خصوصاً عورتوں جیسے کمزور اور مظلوم طبقے کو مردوں کے جبر سے آزادی دلانے کے خوبصورت عنوان سے بین الاقوامی سطح پر کانفرنسوں (قاہرہ، بیجنگ، بیجنگ پلس وغیرہ) کے ذریعے مسلسل دباؤ جاری ہے اور کامیابی سے مغربی تہذیب کی فحاشی، عریانی اور بے حیائی کو مسلمان ممالک پر میڈیا اور تعلیم کے ذریعے تھوپا جا رہا ہے۔

غرض یہ کہ پوسٹ ماڈرنزم گلوبلائزیشن کی موجودہ مغربی تحریک اہل مغرب خصوصاً امریکہ کی سربراہی میں مغربی تہذیب کو عالمگیر بنانے کے لیے اور تیسری دنیا خصوصاً عالم اسلام میں اسے مقبول بنانے بلکہ بہ جبر مسلط کرنے کے لیے ہر قسم کے جائز و ناجائز اور پرامن اور پرتشدد ذرائع استعمال کر رہی ہے اور اس سے مقصود سیاسی غلبہ اور معاشی استحصال ہے ("تہذیبی کشمکش" محض اس کا ایک علمی عنوان ہے)۔

سطور بالا کی بحث سے ہم مندرجہ ذیل نتائج تک پہنچتے ہیں:

۱۔ دوسری قوموں اور تہذیبوں سے الگ مسلمانوں کی ایک مستقل اور منفرد تہذیب ہے، ان کا ایک مخصوص تصور دین اور ورلڈ ویو ہے جو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ان کے فکر و عمل کی تشکیل کرتا ہے۔

۲۔ مغربی تہذیب کی بنیادی فکر اسلامی فکر و عقائد کے بالکل الٹ اور متضاد ہے۔ اسی وجہ سے مغربی تہذیب بھی اپنے سارے عناصر اور مظاہر سمیت اسلامی تہذیب کے بالکل برعکس ہے۔

۳۔ قرآن و سنت اس امر پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ مسلمانوں کے دشمن ہیں اور وہ انہیں دین سے برگشتہ کرنا چاہتے ہیں۔

۴۔ اہل مغرب صدیوں سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت اور بغض رکھتے اور ان کے خلاف انتقامی کارروائیاں کرتے اور انہیں کچلنے اور ختم کرنے کی کوشش کرتے آرہے ہیں اور آج بھی کر رہے ہیں۔

تو اب بتائیے کہ اس سب کے بعد اس امر کی کتنی گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ مسلمان مغربی فکر و تہذیب کو قبول کریں اور اس کی پیروی کریں؟

ہمارا نقطۂ نظر

یہ وہ دلائل ہیں جو امت مسلمہ کے جمہور اہل علم مغربی تہذیب کو رد کرنے کے حوالے سے پیش کرتے ہیں۔ ہمیں ان کے اس نقطۂ نظر سے اصولی طور پر اتفاق ہے کہ مغربی تہذیب کی فکری اساسات اور ورلڈ ویو اسلامی فکر اور ورلڈ ویو سے بالکل مختلف بلکہ اس کے بالکل برعکس اور متضاد ہے اس لیے مسلمان اس امر پر مجبور ہیں کہ وہ مغربی تہذیب کو قبول نہ کریں اور اسے رد کر دیں۔ تاہم اس استرداد کے صحیح مفہوم، نتائج اور تقاضوں پر ہم کچھ وضاحتی گفتگو کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔

مغربی تہذیب کے رد کا مطلب تہذیبی اور سیاسی کشمکش اور مسلح جنگ نہیں

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ بنیادی فکری تضادات کی وجہ سے مسلمان مغربی تہذیب کو

قبول نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے نظریۂ حیات کے مطابق زندگی بسر کریں اور مغربی تہذیب کو نہ اپنائیں۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ وہ مغربی تہذیب کے ساتھ کسی تہذیبی اور سیاسی سرد جنگ اور کشمکش میں الجھیں یا اس کی مسلح مزاحمت کریں۔

یہاں اس حقیقت سے مفر ممکن نہیں بلکہ اس کا ادراک ضروری ہے کہ مسلمان تو کمزور ہیں، مغلوب ہیں، علمی وفکری لحاظ سے، سیاسی لحاظ سے اور اسلحے کے لحاظ سے، لہٰذا وہ تو مغرب کے خلاف کسی سرد یا گرم جنگ کا سوچ بھی نہیں سکتے اور وہ اس کے متحمل بھی نہیں ہو سکتے بلکہ یہ مغرب ہے جو اپنی علمی فوقیت، سیاسی حشمت اور اسلحی قوت کی بالاتری کی وجہ سے فرعون بنا ہوا ہے اور اس کا موقف یہ ہے کہ ؎

چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے

اور یہ اصول تو مغرب کی سپر پاور نے علی الاعلان اپنایا ہوا ہے کہ جو ہمارے ساتھ نہیں (یعنی جو ہمارا مطیع نہیں) وہ ہمارا دشمن ہے اور جس سے ہم خطرہ محسوس کریں گے اسے ہم پیشگی حملہ کر کے ختم کر دیں گے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس (Might is right) کا جنگل کا یہ وہ قانون ہے جس پر امریکہ علانیہ اکیسویں صدی کی ساری ''مہذب'' دنیا کے سامنے عمل کر رہا ہے اور اس کا نشانہ صرف مسلمان ملک بنے ہیں۔ افغانستان اور عراق تباہ کیے جا چکے ہیں جبکہ شام، ایران اور پاکستان کو مسلسل دھمکیوں اور دباؤ میں رکھا جا رہا ہے۔

اِس وقت تک جمہور مسلمانوں کا رویہ انتہائی مدبرانہ، سنجیدہ اور ٹھنڈا ہے۔ مغرب کے ظلم وزیادتی اور دشمنی کے باوجود ان کا موقف یہ ہے کہ ہماری مغرب سے کوئی لڑائی نہیں اور ہم مغرب کے ساتھ کوئی کشمکش نہیں چاہتے، نہ تہذیبی، نہ سیاسی اور نہ اسلحی کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ وہ اس کی قدرت نہیں رکھتے۔ انہیں اپنی کمزوری کا احساس ہے لہٰذا وہ ہر قسم کے تصادم سے بچنا چاہتے ہیں۔ یہ تو مغرب ہے جو اپنی بالاتر قوت کی وجہ

سے انہیں ڈانٹتا ڈپٹتا رہتا ہے کہ تم ہوتے کون ہو ہماری بہترین تہذیب کو قبول نہ کرنے والے اور اپنے نظریے سے چپٹے رہنے والے اور اگر کوئی ملا عمر یا صدام حسین اس دھمکی سے نہ ڈرے تو مغرب اپنی برتر سیاسی اور اسلحی قوت سے اس کا تورا بورا بنا دیتا ہے۔

یہ بات شک و شبے سے بالاتر ہے کہ اس وقت جمہور مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت کی یہی رائے ہے کہ انہیں امن وسکون، سلامتی، استحکام اور ترقی کی ضرورت ہے اور وہ مغرب کے ساتھ کسی سرد جنگ یا مسلح کشمکش میں نہ تو الجھنے کے قابل ہیں اور نہ انہیں الجھنا چاہیے۔ البتہ کچھ مسلمان مغربی ظلم وستم کو برداشت نہیں کر سکے اور وہ ''تنگ آمد بجنگ آمد'' کا اصول اپنانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ وہ چونکہ کمزور ہیں باقاعدہ جنگ اہل مغرب سے نہیں لڑ سکتے لہٰذا انہوں نے گوریلا جنگ شروع کر دی ہے۔ مغرب ان مسلمانوں کو انتہا پسند اور دہشت گرد کہتا ہے۔ گویا اب میدان میں تین فریق ہیں:

۱۔ مغرب، جو اپنی قوت وشوکت کے نشے میں مسلمانوں پر ہر ظلم روا رکھتا ہے، ننگی طاقت کا استعمال کرتا ہے لیکن اسے دہشت گردی نہیں گردانتا بلکہ اسے اپنی اعلیٰ تہذیبی قدروں کی بقا کی جدوجہد قرار دیتا ہے جو انسانیت کی بہتری اور عظمت کے لیے ہے۔ [1] وہ اپنے طاقت ور میڈیا کی طاقت سے اس جھوٹ کو سچ بنا کر پیش کر رہا ہے اور دنیا سے منوانے پر بضد ہے۔ جو چند ہزار مسلمان اس کی مزاحمت کر رہے ہیں وہ انہیں مٹانے اور کچلنے پر مصر ہے اور مسلمان اکثریت پر اس کا شدید دباؤ ہے کہ وہ بھی اس مسلم اقلیت کو کچلنے میں اس کا ساتھ دے۔ [2]

۲۔ ایک معمولی مسلمان اقلیت جو مغربی ظلم وستم اور ننگی جارحیت سے تنگ آ کر مسلح مزاحمت پر تل گئی ہے وہ پٹ رہی ہے، مار کھا رہی ہے، قربانیاں دے رہی ہے

۱۔ فرعون کا بھی یہی موقف تھا جیسا کہ قرآنِ حکیم سے پتہ چلتا ہے۔ ملاحظہ ہو، طٰہٰ ۲۰:۶۳

۲۔ اور جنرل پرویز مشرف جیسے بہت سے کمزور لوگ اس کا ساتھ دے بھی رہے ہیں۔

اور یہی اس کا مقدر ہے جو اسے معلوم ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے موقف پر قائم ہے اور اہل مغرب کے ان ظالم ناخداؤں کو زخم چاٹنے پر مجبور کر رہی ہے۔

۳۔ مسلمان اکثریت (جسے ہم جمہور امت کہتے ہیں) جو مغرب سے کسی تصادم کی قائل نہیں لیکن وہ ایک فیصد مسلم اقلیت کو بھی دل ہی دل میں پسند کرتی ہے اور اس کا عزیمت پر مبنی موقف اس کو اچھا بھی لگتا ہے۔ کچھ اس لیے بھی کہ یہ لوگ اچھے اور باعمل مسلمان ہیں۔

ان تین فریقوں کے تعامل اور کشمکش کے نتیجے میں مسلم دنیا میں دو طبقات اور پیدا ہو گئے ہیں جن کا ذکر یہاں ضروری ہے:

پہلا طبقہ تو ایسے بزدل مسلمان حکمرانوں کا ہے جو مغرب کے ناجائز دباؤ کو برداشت نہیں کر سکے۔ انہوں نے اپنے اقتدار کو تحفظ اور طول دینے کے لیے مغرب کے ناجائز دباؤ کو قبول کر لیا ہے اور جمہور امت کے موقف سے صرف نظر کر لیا ہے۔ بلکہ مغرب کے ساتھ مل کر مذکورہ مسلمان اقلیت کو کچلنے میں مغربی طاقتوں کا ساتھ دینا قبول کر لیا ہے۔ یہ حکمران عموماً سیاسی اور فوجی ڈکٹیٹر ہیں، نہ عوم کی مرضی سے برسر اقتدار آئے تھے اور نہ عوام کی مرضی سے برسر اقتدار رہ سکتے ہیں لہٰذا انہوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا کہ انہیں مغرب کی حمایت میسر آ گئی۔ اور اب وہ ان کے ایجنٹ بن کر دہشت گردی کے خاتمے کے پرفریب نعرے پر مذکورہ مسلمان اقلیت کو کچل رہے ہیں اور جمہور امت کی رائے کو تاراج کر رہے ہیں جو غیر تعلیم یافتہ، مفلس اور غیر منظم ہونے کی وجہ سے غیر موثر ہے۔

دوسرے ابن الوقت، سطحی فکر اور خود غرضانہ اور سقیم و عقیم سوچ رکھنے والے دانشوروں، صحافیوں اور عالموں کا ایک گروہ وجود میں آ گیا ہے جو اپنے ذاتی مفادات اور اپنی ذاتی اغراض کے لیے جمہور امت کے مفادات کو تج کر اہل مغرب کے ایجنڈے کو مسلم معاشرے میں آگے بڑھا رہا ہے۔ ان میں ایک اقلیت ان مسلم علماء اور دانشوروں کی

ہے جو فکری افلاس کا شکار ہیں اور ایک بالا دست تہذیب کی فکر نے ان کے چھوٹے دماغوں کو مسحور کررکھا ہے۔ وہ مغرب سے مرعوب ذہن سے سوچتے ہوئے بڑی دیانت داری سے یہ سمجھتے ہیں کہ مسلم امہ کی بہتری اسی میں ہے کہ وہ اہل مغرب کے راستے پر چلے، ذہنی پسماندگی سے نکلے اور دنیاوی ترقی کے لیے اہل مغرب کے اصول واسالیب کو اپنا لے۔ لیکن ان کی بڑی اکثریت ایسے صحافیوں، دانشوروں اور سیاسی کارکنوں پر مشتمل ہے جن کے پیش نظر محض دنیاوی فائدے ہیں۔ ان کا کوئی اصول نہیں یا یوں کہیے کہ ان کا اصول محض یہ ہے کہ منفعت کہاں سے حاصل ہوسکتی ہے؟ مال کہاں سے مل سکتا ہے؟ نوکری، منصب اور پلاٹ کہاں سے مل سکتے ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جو معاشرے کی تلچھٹ ہیں اور ان کا وجود ملت کے لیے ایک عار اور دھبہ ہے۔ یہ دھرتی کا بوجھ ہیں لیکن اس سے انکار بہر حال نہیں کیا جاسکتا کہ یہ ہمارے معاشرے کا ایک حصہ ہیں بلکہ یہ ابن الوقت ہی اس وقت اپنے ہاؤ ہو کی وجہ سے معاشرے میں نمایاں ہیں۔

فکری اور تہذیبی استرداد سے مقصود تحفظ ذات ہے

جب جمہور مسلمان یہ موقف اختیار کرتے ہیں کہ وہ مغربی تہذیب کو قبول نہیں کرنا چاہتے اس لیے کہ وہ اپنی بنیاد میں غیر اسلامی ہے تو اس سے اصل مقصود کیا ہوتا ہے؟ جیسا کہ اوپر اشارتاً ذکر ہوا کہ اس سے مقصود واضح طور پر یہ ہوتا ہے کہ مسلمان زندگی گزارنے کے اپنے اصولوں پر عمل کریں، اسلامی نظریۂ حیات کو اپنائیں اور مغربی نظامِ حیات کی پیروی نہ کریں۔ یعنی اس سے مقصود مغرب سے کشمکش نہیں، مغرب کو شکست دینا نہیں، مغرب کو چیلنج کرنا نہیں بلکہ اپنے وجود کی حفاظت ہے۔ اسلامی اصطلاح 'حفظ البیضہ' کا یہی مطلب ہے کہ امت کا وجود باقی رہے، امت باقی رہے، امت کا نظریۂ حیات باقی رہے اور ظاہر ہے امت کا وجود صرف اسی وقت باقی رہ سکتا ہے جب وہ اپنے نظریۂ حیات پر عمل کرے، جب وہ اپنے فکری نظام سے محکم طور پر وابستہ ہو جائے اور جب وہ اس پر عمل کرنے کے لیے ہر طرح کی قربانی دینے پر تیار ہو۔

مسلم امت اس وقت کھلی آنکھوں دیکھ رہی ہے کہ بالا دست مغرب جب کہتا ہے کہ وہ مسلم دنیا میں 'جمہوریت' نافذ کرنا چاہتا ہے، 'بنیادی حقوق' کی بحالی چاہتا ہے اور جب وہ گلوبلائزیشن کا نعرہ لگاتا ہے تو اس کا صاف مطلب یہی ہوتا ہے کہ مغرب جمہوریت کے اپنے تصور کو مسلم ممالک میں نافذ کرنا چاہتا ہے جو اصلاً خلاف اسلام ہے۔[1] وہ بنیادی حقوق کے اپنے ان تصورات کو مسلم دنیا میں نافذ کرنا چاہتا ہے جو صریحاً غیر اسلامی ہیں[2] اور رہی گلوبلائزیشن تو وہ محض ایک سٹنٹ، بہانہ اور ذریعہ ہے

۱۔ مغرب میں جمہوریت کا مطلب ہے جمہور کی بالادستی ہر چیز پر، یہاں تک کہ اللہ اور رسول پر بھی۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی جمہوریت کی قائم کردہ اسمبلیوں نے بغیر کسی جھجک اور رکاوٹ کے شراب، زنا، سود اور جوئے کو حلال قرار دیا ہے، ہم جنس پرستی کی اجازت دی ہے۔ بغیر نکاح عورت اور مرد کو اکٹھے رہنے کی اجازت دی ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ محض مغربی جمہوریت کی ایک جھلک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے اکثر پہلو سو فیصد غیر اسلامی ہیں۔ اس کے مقابلے میں اسلام کا نظام حکومت و سیاست کیا ہے اس کی تفصیل کا یہ محل نہیں۔ تاہم اتنی بات واضح ہے کہ اسلام شورائیت کا حامی ہے اور یہ کہ آمریت بہر حال خلاف اسلام ہے۔

۲۔ مغرب کے 'بنیادی انسانی حقوق' کا اساسی فلسفہ بھی سو فیصد غیر اسلامی ہے۔ یہ فلسفہ کہتا ہے کہ انسان آزاد ہے (یعنی مادر پدر آزاد ہے) اور جو چاہے کر سکتا ہے اور جیسے چاہے زندگی گزار سکتا ہے، اس پر کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔ جبکہ اسلام کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ انسان آزاد نہیں اللہ کا عبد ہے، مسلمان کہتے ہی اس کو ہیں جو اپنی آزادی اللہ کے آگے تج دے اور اس کی غیر مشروط اطاعت کرے۔ وہ مسلمان مسلمان ہی نہیں جو اللہ اور رسول کے مقابلے میں اپنی مرضی کرے۔ یہ صرف بنیادی تصور کی بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مغرب کے بنیادی حقوق کی ساری تفصیل اپنی کنہ میں غیر اسلامی ہے۔ اسلام نے بلا شبہ انسانوں کو بہت سارے حقوق دیے ہیں اور ان کی بہت ساری ذمہ داریاں مقرر کی ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ تاہم یہ بات واضح ہے کہ اسلام اپنی مقرر کردہ حدود کے اندر حریت فکر و عمل کا داعی ہے اور عورتوں، بچوں، کمزوروں کے حقوق کا تحفظ کرتا ہے۔

مغرب کی سیکولر اقدار کی یونیورسلائزیشن کا اور مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام اور معاشی مفادات کے غلبے کا۔ لہٰذا مسلمان جب یہ کہتے ہیں کہ وہ مغربی تہذیب کو قبول نہیں کریں گے تو اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی بقا چاہتے ہیں، وہ بحیثیت مسلمان زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اسلام کے اصولوں اور اس کی اقدار پر عمل کرنا چاہتے ہیں اور بس۔ یہ نقطۂ نظر جارحانہ نہیں مدافعانہ ہے۔ وہ مغربی تہذیب کو چیلنج نہیں کرتے اور اسے ختم کرنے کی بات نہیں کرتے۔ وہ تو صرف یہ کہتے ہیں کہ ہمیں ہمارے معتقدات کے مطابق زندگی گزارنے دو۔ ہمیں ایسے جینے دو جیسے ہم جینا چاہتے ہیں۔ اگر ہم مغرب کا پینٹ کوٹ اور نکٹائی نہیں پہننا چاہتے تو ہمیں اپنی شلوار قمیص، دھوتی پائجامہ اور عبا پہننے دو۔ اگر ہم سود والی معیشت نہیں چاہتے تو ہمیں بلا سود معیشت چلانے دو۔ اگر ہماری شوریٰ (پارلیمنٹ) اللہ اور رسول کے احکام کو بالاتر سمجھتی ہے تو ہمیں ایسا سمجھنے دو۔ غرض جب مسلمان کہتے ہیں کہ وہ مغربی تہذیب کو رد کرتے ہیں تو اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی بقا چاہتے ہیں اور اپنے نظریۂ حیات پر عمل کرتے ہوئے زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ موقف بہت متوازن ہے، عادلانہ ہے، مبنی بر انصاف ہے۔ ہر معقول اور شریف آدمی کو جمہور مسلمانوں کے اس موقف کو سراہنا چاہیے۔

یہ استرداد مانع استفادہ نہیں

بلاشبہ یہ موقف صحیح ہے کہ ہمیں مغربی تہذیب کو رد کر دینا چاہیے لیکن اس استرداد سے مراد کلی استرداد نہیں۔ اور اس کے کئی اسباب ہیں جو شرعاً مقبول ہیں۔ یہ بحث چونکہ دقیق ہے لہٰذا قارئین سے درخواست ہے کہ وہ توجہ سے ہماری مندرجہ ذیل گزارشات پر غور فرمائیں:

۱۔ شارع نے جتنے احکام بھی مقرر فرمائے ہیں ان سے مقصود انسانوں کے مصالح کی حفاظت ہے تاکہ انسان کو حقیقی خوشی اور سعادت میسر آسکے اور وہ کم سے کم معاصی اور مشکلات میں الجھے۔

۲۔ بعض معاملات میں شریعت جب کسی چیز کے رد و قبول کا فیصلہ کرتی ہے تو

اس کے سو فیصد نافع اور غیر نافع ہونے کی بنا پر نہیں کرتی بلکہ ظن غالب کی بنیاد پر کرتی ہے چنانچہ دیکھیے کہ قرآن حکیم شراب اور جوئے کے بارے میں علی الاعلان کہتا ہے کہ ان کے کچھ فائدے بھی ہیں لیکن چونکہ ان کے مضرات ان کے فوائد کی نسبت زیادہ ہیں اس لیے شارع نے انہیں حرام قرار دے دیا۔[۱]

پھر نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جس مسکر (ہر نشہ آور چیز) کی کثیر مقدار حرام ہو اس کی قلیل مقدار بھی حرام ہے۔[۲] حالانکہ عمومی مشاہدہ یہ ہے کہ اس کی قلیل مقدار وہ نتیجہ مرتب نہیں کرتی جس کی وجہ سے اسے حرام کیا گیا تھا مثلاً اگر کوئی آدھا گھونٹ شراب پی لے تو اسے نشہ نہیں ہوگا، جو ممانعت شراب کی علت ہے، لیکن شارع حکیم نے اس سے اس لیے منع فرمایا ہے کہ اس کی قلیل مقدار کا مسلسل استعمال، ظن غالب میں، اس کے کثرت استعمال پر منتج ہوگا یعنی اگر کوئی شخص روزانہ آدھا گھونٹ شراب پی لے، یہ سمجھتے ہوئے کہ اس سے نہ تو نشہ ہوتا ہے اور نہ کوئی دوسرا بڑا نقصان، لہٰذا اس میں حرج ہی کیا ہے؟ تو اگرچہ اس کی یہ دونوں باتیں صحیح ہیں (کہ نہ تو نشہ ہوگا نہ صحت کا بڑا نقصان) لیکن انسانی سرشت کو دیکھتے ہوئے اس امر کا امکان غالب ہے کہ جو روز تھوڑی سی شراب پیتا ہے وہ کسی نہ کسی روز زیادہ بھی پیے گا، اس لیے شریعت نے ظن غالب کی بنیاد پر اس سے منع کر دیا اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ شراب سے کلی اجتناب کرو، تھوڑی سی بھی نہ پیو، بطور دوا بھی نہ پیو[۳] چکھو بھی نہیں اور اس کے قریب بھی نہ جاؤ۔[۴]

۳۔ جس طرح پہلے ذکر ہو چکا کہ مغربی ورلڈ ویو اسلامی ورلڈ ویو سے مختلف بلکہ اس کے متضاد ہے۔ اسی طرح اس ورلڈ ویو پر مبنی مغرب علمیات یعنی مغربی نظریۂ علم اور تصور علم بھی مسلم نظریۂ علم سے مختلف ہے جیسا کہ ذیل کے جدول سے ظاہر ہے:

۱۔ البقرہ۲:۲۱۹

۲۔ سنن ترمذی، کتاب الاشربہ، باب ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام

۳۔ صحیح مسلم، کتاب الاشربہ، باب تحریم تداوی بالخمر

۴۔ سنن ابی داود، کتاب الاطعمہ، باب الجلوس علی مائدۃ علیہا بعض ما یکرہ

مسلم نظریۂ علم

۱۔ مآخذ علم: قرآن وسنت بنیادی مآخذ۔ انسانی عقل اور مشاہدہ وتجربہ کی حیثیت ثانوی مآخذ کی ہے جو قرآن وسنت کے تابع ہیں۔

۲۔ مقصد علم: خدا آگاہی: تاکہ انسان اللہ، اس کے حقوق اور احکام سے واقف ہوسکے۔ خود آگاہی: تاکہ انسان عبد اور خلیفہ ہونے کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ ہوکر ان سے عہدہ برآ ہوسکے۔

۳۔ طریق کار: مسلم علمیات کے مطابق تطور علم و ابلاغ علم (یعنی عمل تعلیم) ایسے طریقے سے کہ مسلم ورلڈ ویو کا مطلوبہ انسان تیار ہوسکے۔

۴۔ غایت علم: دنیا میں اللہ کی اطاعت اور آخرت میں کامیابی یعنی حصول رضائے الٰہی (اگر مسلمان بحیثیت مجموعی بطور امت اللہ کے احکام پر عمل پیرا ہوں گے تو وہ دنیا میں بھی کامیاب ہوں گے)۔

۵۔ انواع علم:

i- علم مبنی بروحی (قرآن وسنت)

ii- علوم آلیہ: جو علوم وحی کی تحصیل کے لیے ضروری ہیں جیسے عربی زبان کا علم۔

مغربی نظریۂ علم

۱۔ مآخذ علم: بنیادی مآخذ انسانی عقل اور مشاہدہ وتجربہ۔ مذہب کی برائے نام حیثیت۔

۲۔ مقصد علم: انسانی صلاحیتوں کی نموء تاکہ انسان دنیاوی زندگی کامیابی سے گزار سکے۔

۳۔ طریق کار: مغربی علمیات کے مطابق تطور علم اور ابلاغ علم (یعنی عمل تعلیم) ایسے طریقے سے کہ مغربی ورلڈ ویو کا مطلوبہ انسان تیار ہوسکے۔

۴۔ غایت علم: بحیثیت قادر مطلق کائنات کی تسخیر اور دنیا میں کامیابی۔

۵۔ انواع علم:

i- مذہبی علم

ii- سوشل سائنسز یعنی عمرانی علوم جیسے معاشیات، سیاسیات، قانون، تعلیم وغیرہ

iii- وہ علوم جو وحی اور عقل دونوں کے امتزاج پر مبنی ہیں (سارے اجتماعی علوم جیسے معاشیات، سیاسیات، تعلیم، قانون، نفسیات وغیرہ)۔	iii- نیچرل وفزیکل سائنسز جیسے فزکس، کیمسٹری، بیالوجی، میڈیسن وغیرہ۔
iv- وہ علوم جن کا غالب حصہ انسانی عقل و تجربہ پر مبنی ہے جیسے طب، ہندسہ (انجینئرنگ)، زراعت وغیرہ۔ ان علوم کا تطبیقی پہلو یعنی فنون و ٹیکنالوجی بھی اسی نوع علم کا جزو ہیں۔	iv- ٹیکنالوجی جیسے کمپیوٹر کا استعمال (انفارمیشن ٹیکنالوجی)۔

مندرجہ بالا جدول سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ مسلم تصور علم اور مغربی تصور علم کہاں ایک دوسرے سے دور ہیں اور کہاں قریب۔ مسلم تصور علم اپنے مآخذ اور غایت میں مغربی تصور علم کے الٹ ہے لیکن انواع علم میں ایسے علوم وفنون دونوں میں مشترک ہیں جو زیادہ تر انسانی عقل و تجربہ پر مبنی ہیں، لہٰذا ان علوم میں مسلمان مغرب سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ اجتماعی علوم بھی مشترک ہیں لیکن چونکہ وہ زیادہ تر ورلڈ ویو پر مبنی ہوتے ہیں لہٰذا ان میں مسلمانوں کے لیے مغربی علوم سے استفادے کی گنجائش بہت تھوڑی ہے اور جو ہے وہ بھی بہت احتیاط کا تقاضا کرتی ہے اور اس کی شرط یہ ہے کہ اس کا طریقۂ کار ایسا ہونا چاہیے کہ مغربی علوم وتہذیب کے یہ اجزاء بالآخر مسلم فکر وتہذیب کا رنگ قبول کر لیں اور اس میں جذب ہو کر اس کا ایک حصہ بن جائیں نہ یہ کہ مسلمان ان علوم کو اس طرح قبول کریں کہ خود اس کے رنگ میں رنگے جائیں۔

۴۔ جب کسی فکر، دین، عقیدے، تہذیب سے آپ کی فکر، دین، عقیدے اور تہذیب کا واضح اختلاف سامنے آ جائے تو اب آپ کی شناخت (identity) کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اپنی بات، عقیدے، رسم ورواج پر مداومت اختیار کریں اور مخالف فکر اور اس کے

رسم ورواج کے قریب بھی نہ پھٹکیں۔ چنانچہ بہت سارے امور میں ہمیں نبی کریم ﷺ کا یہ قول گرامی نظر آتا ہے کہ 'خالفوا الیھود و النصاری' [۱] یعنی یہود ونصاری کی مخالفت کرو مثلاً فرمایا داڑھی بڑھاؤ اور مونچھیں کٹواؤ اور یہود ونصاری کی مخالفت کرو [۲] (کیونکہ وہ داڑھی کٹواتے اور مونچھیں بڑھاتے ہیں) اور آپ ﷺ نے اس اصول پر اتنا اصرار فرمایا کہ اس کا دائرہ بظاہر بے ضرر چیزوں تک بڑھا دیا مثلاً آپ نے دس محرم کو نفلی روزہ رکھا۔ جب آپ ﷺ کو بتایا گیا کہ یہودی بھی دس محرم کو روزہ رکھتے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگلے سال تک میں زندہ رہا تو صرف دس کی بجائے نو اور دس کے روزے رکھوں گا [۳] تاکہ یہود سے الگ ہماری اپنی ایک شناخت اور طریقہ مقرر ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ 'من تشبه بقوم فهو منهم' [۴] یعنی جو کوئی (کھانے پینے، پہننے اوڑھنے وغیرہ میں) کسی دوسری قوم سے مشابہت اختیار کرے تو وہ اسی میں سے ہے یعنی آں جناب ﷺ نے اس کو اتنا برا سمجھا کہ اس کا اسلام ہی مشکوک قرار دے دیا اور اس کے وجود کی نفی فرما دی اور فرمایا کہ جو ایسا کرے وہ ہمارا نہیں انہی کا ہے کیونکہ وہ انہی جیسا بننا چاہتا ہے۔ تو شریعت کی سپرٹ یہ ہے کہ جو فکر، دین، عقیدہ، تہذیب مسلمانوں کی فکر، دین، طریقے، تہذیب سے مختلف ہو، ہرگز ہرگز مسلمانوں کو اس کی پیروی نہیں کرنی چاہیے بلکہ اصرار سے اور التزام سے ان سے مشابہت سے اور ان کی پیروی سے بچنا چاہیے کیونکہ اسی میں ان کی منفرد، الگ اور مستقل فکر، وجود اور تہذیب کے تشخص کی بقا کا راز پوشیدہ ہے۔ چنانچہ ہم آپ ﷺ کے تیار کیے ہوئے اصحاب کو دیکھتے ہیں تو حیران ہوتے ہیں کہ ان کی نگاہ اس سلسلہ میں کتنی دور رس تھی، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شرعی

۱۔ مسند احمد بن حنبل، ج:۵، ص:۲۶۴، ۲۶۵

۲۔ صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب ماذکر عن بنی اسرائیل

۳۔ صحیح مسلم، کتاب الحیض، باب جواز غسل الحائض..........

۴۔ سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب فی لبس الشهرة

طور پر مباح ہونے کے باوجود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہود ونصاریٰ کی عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے سے روک دیا اور ذمی عورتوں کو مسلمان عورتوں جیسا لباس پہننے سے منع کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے یہ اقدامات منشائے نبوت کے عین مطابق تھے یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے انہیں قبول فرمایا اور کسی نے ان کی نکیر نہیں کی۔

۵۔ مذکورہ بالا احکام اور شدت کے باوجود چونکہ شارع کے پیش نظر یہ ہے کہ لوگ اسلام کو دل سے قبول کریں اور طبائع اس سے مانوس ہو جائیں لہٰذا جہاں گنجائش ہو وہاں شارع مقامی اعراف اور رسم و رواج کو، جہاں تک وہ اسلامی سپرٹ سے مطابقت رکھتے ہوں، قبول کرتا ہے اور خواہ مخواہ ان سے نہیں الجھتا۔ اس کی بے شمار مثالیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے ملتی ہیں جن میں سے چند ایک کی طرف ہم اپنے قارئین کی توجہ مبذول کرائیں گے:

- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جاہلیت میں طلاق کے کئی طریقے مروج تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب رد فرما دیے اور صرف وہ ایک طریقہ باقی رکھا جو فطرت کے قریب تھا یعنی تین طلاقوں کا موجودہ طریقہ۔ (۱)

- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے انصار کی ایک یتیم بچی پالی ہوئی تھی، جب وہ بالغ ہوگئی تو میں نے اس کے نکاح کا پروگرام رکھا۔ اتفاق سے اُس دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے باہر تھے۔ واپس آئے تو پوچھا کہ کیا بچی کو رخصت کر دیا؟ میں نے کہا 'ہاں'۔ اس پر آپؐ نے پوچھا کہ (بچیوں کی رخصتی کے موقع پر گائے جانے والے) گانے بھی گائے کہ نہیں؟ میں نے کہا 'نہیں'۔ آپؐ نے فرمایا 'تمہیں یہ کرنا چاہیے تھا کیونکہ انصار اسے پسند کرتے ہیں۔ (۲)

۱۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، باب فی وجوہ النکاح۔۔ التی کان یتناکح بہا اہل الجاہلیہ

۲۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب النسوۃ التی یہدین المرأۃ

- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ اگر مجھے قریش مکہ کے بدکنے کا خدشہ نہ ہوتا (کہ انھوں نے آخر میں اسلام قبول کیا تھا اور اسلامی تربیت کا رنگ ان پر بہت گہرا نہ تھا) تو میں کعبہ کو گرا کر اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام والی بنیادوں پر از سرِ نو تعمیر کر دیتا۔[1]

٦۔ یہی وجہ ہے کہ فقہائے اسلام نے عرف اور مقامی رسم و رواج کو حکم شرعی کے مآخذ میں سے ایک ماخذ قرار دیا ہے۔ مالکیہ تو اس میں منفرد ہیں کہ وہ عمل اہل مدینہ کو حجت مانتے ہیں اور احناف بھی، جو عصری تقاضوں سے مطابقت کا شدید رجحان رکھتے ہیں، مقامی اعراف کو بہت اہمیت دیتے ہیں[2] اور مشہور حنفی فقیہ امام ابن عابدین نے تو اس پر مستقل رسالہ لکھا ہے۔ اس طرح ماہرین اصول فقہ معاصر اور مقامی حالات سے واقفیت کو شرط اجتہاد قرار دیتے ہیں۔[3]

٧۔ انبیاء کرام اور فقہاء عظام پہلے سے مروج علوم و اعراف کو جو اتنی اہمیت دیتے ہیں اس کے کئی قابل فہم اسباب ہیں:

- اللہ تعالیٰ کی سنت کے مطابق شروع ہی سے ہر قوم میں پیغمبر مبعوث ہوتے رہے ہیں۔ بعد میں اگر لوگ اس آسمانی ہدایت میں تحریف کر لیں اور اس پر عمل کو ترک بھی کر دیں تو سابقہ شریعت کے مقرر کردہ وہ ضابطے جو رسم و رواج اور اعراف کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، کسی حد تک مروج رہتے ہیں۔ گویا وہ قومیں جو اس وقت مسلمان نہیں ہیں، ان میں سابقہ شرائع سے منتقل ہونے والے کئی رسم و رواج ایسے ہو سکتے ہیں جو اپنی اصل شکل یا روح کو محفوظ رکھے ہوئے ہوں۔ ایسے رسم و رواج اور اعراف کو قبول کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ہمارے ماہرین اصول فقہ، ان امور

١۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، باب فضل مکہ و بنیانہا

٢۔ امام سرخسی، المبسوط، ج ١٣، ص ١٤، دار الکتاب العربی القاہرہ، ١٣٧٢ھ

٣۔ دکتور محمد سلام مدکور، مناہج الاجتہاد، ص ٣٦٤، طبع جامعۃ الکویت

میں جہاں قرآن وسنت کا صریح اور واضح حکم موجود نہ ہو، سابقہ شرائع کے احکام کو حجت مانتے ہیں۔[1]

۔ دوسری قوموں کے بہت سے رسم ورواج عقل اور انسانی تجربات پر مبنی ہوتے ہیں جو اکثر اوقات حکمت سے خالی نہیں ہوتے اور عقل کے بارے میں شریعت کا موقف یہ ہے کہ وہ بنائے احکام تو نہیں البتہ دلیل احکام ضرور ہے یعنی اسلامی شریعت میں احکام کی بنیاد وحی پر ہے نہ کہ محض عقل پر (گو وحی کے منصوص احکام، بر بنائے حکمت الٰہی، عقلی تقاضوں کو پورا کرتے ہیں) لیکن جہاں حکم شرعی واضح نص کی صورت میں موجود نہ ہو وہاں منصوص شرعی احکام کی روشنی میں عقل کا استعمال ہی بنائے احکام ہوتا ہے اور اس کی بنیاد (منجملہ دوسری نصوص کے) مشہور حدیث معاذؓ ہے جس میں آپ ﷺ نے حضرت معاذؓ کی تحسین فرمائی جب انہوں نے آپؐ کے استفسار کے جواب میں کہا کہ قرآن و سنت کے احکام کی عدم موجودگی میں وہ عقل (اجتہاد) سے فیصلے کریں گے[2] اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی معاملے میں شرعی نص موجود نہ ہو اور شرعی احکام کا منشا پورا ہو رہا ہو یا بدرجہ آخر جہاں کسی شرعی حکم کی خلاف ورزی نہ ہو رہی ہو تو وہاں بوقت ضرورت کسی مقامی عرف یا کسی دوسری قوم/تہذیب کے عقلی اور انسانی تجربات سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

مندرجہ بالا گزارشات کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات اور ان کی سپرٹ کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمانوں کو اصولاً تو مغربی تہذیب کو رد کر دینا چاہیے (کیونکہ وہ بنیادی طور پر خلاف اسلام اصولوں پر مبنی ہے اور اہل مغرب صدیوں سے مسلسل اسلام اور مسلم دشمنی کا واشگاف مظاہرہ کر رہے ہیں) اور اہلِ مغرب کی پیروی کرنے کی بجائے اپنے علیحدہ فکری، ثقافتی، تہذیبی اور سیاسی وجود کو برقرار رکھنے کی جدوجہد کرنی چاہیے۔ تاہم

۱۔ امام غزالی، المستصفی من علم الاصول، ج ۲، ص ۱۳۲، مطبع مصطفی محمد القاہرہ، ۱۹۳۷ء

۲۔ سنن ابی داود، کتاب القضاء، باب اجتہاد الرأی فی القضاء

اس استرداد کے بعد اپنے نظریۂ حیات کے مطابق زندگی گزارتے ہوئے اور اپنے مصالح اور اہداف کے مطابق طے کردہ منہج پر عمل کرتے ہوئے اور اپنا علیحدہ تشخص برقرار رکھتے ہوئے اگر کہیں مغربی علوم وفنون یا ان کے انسانی تجربات سے استفادہ کرنے کی ضرورت پڑ جائے تو یہ حرام اور ناجائز نہیں ہے۔

اس حقیقت کا انکار نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہم مسلمانوں کو اس کا انکار کرنا چاہیے کہ ہر تہذیب صدیوں کا سفر اپنے اصولوں کے مطابق طے کرتی ہے، اس کا اپنا ایک مخصوص رنگ اور مزاج ہوتا ہے لیکن اس سفر میں، خصوصاً جزئیات وفروعات میں، وہ دوسری تہذیبوں سے اخذ واستفادہ بھی کرتی ہے اور یوں دوسروں کے رنگ کو اپنے رنگ میں جذب کرتی ہے لیکن اپنے اصل رنگ ومزاج اور خصوصیات کو برقرار رکھتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔ اس طرح کا اخذ واستفادہ مذموم نہیں ہوتا۔ یہی کچھ مسلم تہذیب نے بھی کیا۔ اس کے اپنے اصول تھے، اس کا اپنا ایک مخصوص رنگ اور مزاج تھا اور صدیوں کا یہ سفر اس نے اپنے انہی اصولوں اور اس مخصوص رنگ اور مزاج کے مطابق جاری رکھا تاہم اس نے، خصوصاً جزئیات وفروعات میں، دوسری قوموں/تہذیبوں سے استفادہ بھی کیا۔ یونانی علوم بھی اس پر اثر انداز ہوئے اور ایرانی و ہندی تہذیبوں نے بھی اس کے نقوش پر اثر ڈالا لیکن اس سے مسلم تہذیب کے تشخص کو کبھی خطرہ لاحق نہیں ہوا۔ اسی طرح مغربی تہذیب کے بھی اپنے اصول اور اپنا رنگ اور مزاج ہے جو اس کے مخصوص تشخص کی بنیاد ہے۔ اس نے بھی مسلم تہذیب سے استفادہ کیا ہے لیکن اپنا راستہ اور اپنا رنگ ڈھنگ نہیں بدلا۔

آج ہمارا دستور العمل بھی یہی ہونا چاہیے۔ مسلم تہذیب کے اپنے اصول ہیں، اپنا رنگ اور مزاج ہے اور مغربی تہذیب اس سے مختلف اور متضاد اصولوں کی حامل ہے اور اس کا اپنا مزاج اور رنگ ہے جو مسلم اصولوں اور تہذیب سے بالکل مختلف ہے۔ لہٰذا آج ہم مسلمانوں کے لیے صحیح راہ عمل یہی ہے کہ ہم اپنے اصولوں سے جڑے رہیں،

اپنی تہذیب سے وابستہ رہیں اور مغربی اصولوں اور اس کی تہذیب کو علیٰ وجہ البصیرت رد کر دیں۔ تاہم رد کرنے کے بعد اپنے نظریۂ حیات پر عمل کرتے ہوئے اور اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی گزارتے ہوئے بوقت ضرورت دائرۂ مباحات میں مغربی تہذیب سے کچھ اخذ واستفادہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

البتہ ہمیں اِس موقع پر بہت احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ اہل مغرب اس وقت بالا دست ہیں اور مسلمان اس وقت کمزور اور ہزیمت خوردہ ہیں اور اسی طرح مغربی فکر و تہذیب اس وقت غالب و بالاتر ہے اور مسلم فکر و تہذیب اس وقت کمزور اور ناتواں ہے لہٰذا کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم مرعوب ذہن کے ساتھ مغربی فکر و تہذیب کی پیروی شروع کر دیں۔ کیونکہ اگر ہم نے ایسا کیا تو اس سے ہمارے اصولوں کی نفی ہوگی، اس سے ہماری تہذیب کی نفی ہوگی، اس سے ہمارے منفرد فکری و عملی وجود کی نفی ہوگی۔ لہٰذا ہمیں غیر معمولی احتیاط اور عزم کی ضرورت ہے کہ ہم نے اپنے اصولوں پر عمل کرنا ہے اور اپنی تہذیب سے محکم وابستگی اختیار کرنا ہے نہ کہ مغربی تہذیب کی پیروی کرنا ہے۔

امید ہے اس وضاحت سے ہمارا یہ موقف واضح ہو گیا ہوگا کہ ہمیں مغربی تہذیب کو رد کرنا ہے اور مسلم تہذیب کو اپنانا ہے لیکن ایسا کرتے ہوئے ہم اہل مغرب سے تھوڑا بہت محتاط استفادہ کر سکتے ہیں جس کی تفصیلات کی طرف ہم نے سطور بالا میں اشارہ کیا ہے۔

مغرب کا ردِّ عمل

بظاہر ہماری بات مکمل ہوگئی لیکن یہاں ایک اور الجھن کو بھی سلجھا لینا چاہیے اور وہ یہ کہ مسلمانوں کے اس موقف پر، کہ وہ اپنی مرضی سے مغربی فکر و تہذیب کی کچھ چیزیں لے لیں اور کچھ کو رد کر دیں، مغرب کا ممکنہ ردِ عمل کیا ہو سکتا ہے؟ عام تاثر یہ ہے کہ مغرب اس موقف کو توہین آمیز سمجھ کر حقارت سے رد کر دے گا کیونکہ مسلمان اس وقت مغرب کے مقابلے میں کمزور ہیں اور کمزور کو یہ حق کون دیتا ہے کہ وہ طاقتور سے اپنی مرضی منوائے؟ بلکہ مسلمانوں کی حیثیت تو اس وقت مانگنے والے گداگر کی سی ہے کہ اکثر

مسلمان ملک مغربی ممالک اور اداروں کے مقروض ہیں اور مانگنے والے کو یہ حق کون دیتا ہے کہ وہ دینے والے سے یہ مطالبہ کرے کہ آج وہ گندم کی بجائے چاول کھائے گا؟

ہماری رائے یہ ہے کہ بلاشبہ یہ موقف مغرب کے لیے اشتعال انگیز اور ناقابل قبول ہوسکتا ہے لیکن اس کے باوجود مغرب یہ رویہ نہیں اپنائے گا کہ اگر تم ہماری جمہوریت اور سیکولرزم کو نہیں مانتے تو جاؤ، ہم تمہیں اپنی سائنس و ٹیکنالوجی بھی نہیں دیں گے اور اس کے دو بڑے سبب ہیں:

ایک تو یہ کہ مغرب بنیا ہے، اسے بہر حال اپنا مادی مفاد عزیز ہے اور مسلم دنیا اس کی مارکیٹ ہے، اس کی ٹیکنالوجی اور ٹیکنالوجی پروڈکٹس کی خریدار ہے مثلاً اپنی اعلیٰ ٹیکنالوجی کی بنیاد پر مغرب بہترین اسلحہ تیار کرتا ہے۔ اب اگر مسلمان ممالک یہ اسلحہ نہیں خریدتے تو اس کی اسلحہ ساز فیکٹریاں بند ہو جائیں گی لہٰذا مغرب اپنے معاشی مفاد کے لیے اپنی ٹیکنالوجی مسلمان ممالک کو بہر حال فروخت کرتا رہے گا۔

دوسرے یہ کہ مغرب مسلمان ممالک کو محض ٹیکنالوجی ہی نہیں دیتا اور ٹیکنالوجی پروڈکٹس ہی نہیں بیچتا بلکہ اس عمل کو مسلم معاشرے میں نفوذ کا ایک ذریعہ بھی بناتا ہے مثلاً وہ مسلمان ممالک کو ٹی وی مشینری بیچتا ہے، تو اس سے وہ محض تجارت ہی نہیں کرتا بلکہ ٹی وی انجینئروں اور پروڈیوسروں کی تربیت بھی کرتا ہے، انہیں اپنے پروگرام بھی مہیا کرتا ہے اور اس طرح ٹی وی کے ذریعے اپنی فکر، اپنی اقدار اور اپنی تہذیب کو مسلمان معاشرے میں فروغ دیتا ہے۔

ان دو اسباب کی بنا پر ہم نہیں سمجھتے کہ مسلمانوں کے اس موقف پر مغرب یہ رویہ اختیار کرے گا کہ جاؤ جہنم میں، میں تمہیں کچھ نہیں دوں گا۔ البتہ اس نے اپنی حکمت عملی سے یہ انتظام ضرور کر لیا ہوا ہے کہ مسلمانوں میں ایسی قیادت پیدا ہی نہ ہو جو یہ موقف اختیار کرے۔ دیکھیے! اس موقف کو اپنانے کے لیے فراست بھی درکار ہے اور جرأت

بھی۔اور بدقسمتی سے مسلم ممالک میں اس وقت جو سیاسی قیادت ہے اس میں ہوسکتا ہے کچھ اور خوبیاں ہوں، یہ دو خوبیاں بہر حال نہیں ہیں اور یہی مسلمانوں کی ناکامی کا بنیادی سبب ہے۔مہاتیر محمد نے اس کا تھوڑا سا مظاہرہ کیا ہے۔شاہ فیصل نے مغرب کا تیل بند کر کے اور صحرا میں خیمہ لگا کر اور وہاں مغربی سفیروں کو بلا کر یہ پیغام دینے کی کوشش کی تھی کہ ہم کھجوریں کھا کر اور اونٹنیوں کا دودھ پی کر گزارا کر سکتے ہیں۔اگر چہ یہ محض ایک لطیف پیغام تھا، کوئی پختہ پلاننگ اور عزم اس کے پیچھے نہ تھا لیکن مغرب کے عالی دماغوں کو یہ ادا بھی پسند نہ آئی اور انہوں نے وہ شاخ ہی کاٹ دی جو برگ و بار لاسکتی۔یہاں جو بھی "Friends not Masters" کی حقیقت کا ادراک کرنا شروع کرتا ہے، اس کا پتا کاٹ دیا جاتا ہے، رہے نام اللہ کا۔

استرداد کے باوجود قبولیت کے بعض مظاہر اور ان کے اسباب

فکری اور نظریاتی سطح پر اس استرداد، مغرب کی اسلام اور مسلم دشمن پالیسیوں سے عمومی اختلاف ونفرت اور بعض مسلم گروپوں کی طرف سے اہل مغرب کی مسلح مزاحمت کے باوجود یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ مسلم معاشرے میں ثقافتی، سیاسی اور علمی سطح پر مغربی فکر وتہذیب سے مرعوبیت کا تاثر بلکہ جزواً اس کی پیروی کے مظاہر بھی عام ہیں۔یہ صورت حال بیک وقت مضحکہ خیز بھی ہے اور افسوسناک بھی۔اور بعض لوگ اسے بنیاد بنا کر سطور بالا میں بیان کردہ ہمارے موقف کی تغلیط کی کوشش بھی کر سکتے ہیں لیکن ہم اس بات پر مطمئن ہیں کہ ہمارا تجزیہ اور بیان کردہ موقف صحیح ہے۔مین اسٹریم اسلام اور جمہور امت کے مغربی فکر وتہذیب کو رد کرنے کے باوجود اس سے متاثر ہونے یا جزواً اس پر عمل پیرا ہونے کے اسباب ومحرکات درج ذیل ہیں:

- مغربی تہذیب اس وقت بہر حال ایک غالب اور بالادست تہذیب ہے لہٰذا کمزور اذہان وکردار کے مسلمانوں کا اس کی ظاہری چکاچوند اور قوت وحشمت سے متاثر ہو جانا قابل فہم ہے۔
- مسلمان بحیثیت امت اور معاشرہ اس وقت اگر کمزور اور خوار وزبوں ہیں تو اس

کی بنیادی وجہ ان کی منافقت ہے یعنی فکر و عمل میں بُعد ہونا۔ جب اپنے بنیادی نظریۂ حیات (اسلام) کے حوالے سے ان کا رویہ منافقانہ ہے تو اس پر کیا تعجب ہے کہ مغربی تہذیب کے حوالے سے بھی ان کا رویہ منافقانہ ہو یعنی دل میں اسے برا سمجھنا، زبان سے اسے برا کہنا لیکن عملاً ان کی نقل کرنا۔

- مغرب کے اسلام اور مسلمان دشمن رویے کو سمجھنے کے باوجود، اور سیاسی اور مسلح مزاحمت کے نتیجے میں مغربی استعمار سے آزادی حاصل کرنے کے باوجود، یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمان خصوصاً ان کے بالادست طبقات اہل مغرب کے سیاسی، معاشی اور سماجی نظام سے مرعوب و متاثر ہیں۔ اس مظہر کے چند بڑے اسباب درج ذیل ہیں:

۱۔ مغربی استعمار نے صرف مسلم ممالک پر قبضہ نہیں کیا بلکہ مغلوب مسلمانوں کے دل و دماغ کو فتح کرنے کے لیے دوررس اور لمبی مدت کی پلاننگ کی جو کامیاب ثابت ہوئی۔

۲۔ اس کے نتیجے میں جب انہیں بالجبر مسلم علاقے خالی کرنے پڑے تو انہوں نے اقتدار بالعموم ان قوتوں کو منتقل کیا جو ذہنی، تہذیبی اور نظریاتی طور پر اس سے متاثر بلکہ اس کی تیار کردہ تھیں۔

۳۔ مسلمان آزادی کے باوجود مذکورہ بالا سبب سے نیز افلاس، عدم تنظیم اور تعلیم کی کمی وغیرہ کی وجہ سے اپنے معاشرے میں تعلیمی، سیاسی، سماجی ...... نظام کو اپنے نظریۂ حیات (یعنی اسلام) کے مطابق ڈھالنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

۴۔ اس دوران میں مغرب نے (جہاں ضرورت پڑی اپنی جنگی قوت کے ساتھ مسلمانوں کو کچلنے کے ساتھ ساتھ) اپنے طاقت ور میڈیا اور پروپیگنڈا مشینری کے ذریعے اپنی اقدار اور اپنے اصولوں کی یونیورسلائزیشن اور خصوصاً مسلم معاشروں میں ان کی ترویج کی حکمت عملی جاری رکھی۔

ان اسباب کی بنا پر مسلمان معاشروں میں مغرب سے نفرت اور مغربی تہذیب کو قبول نہ کرنے کے ادعا کے باوجود مختلف سطحوں پر مغربی اقدار اور رسم و رواج کی پیروی کے مظاہر بھی عام دیکھنے کو ملتے ہیں۔

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات

رعنائیِ تعمیر میں، رونق میں، صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات

ظاہر میں تجارت ہے، حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگِ مفاجات

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات

بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم
حد اُس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ؟
دُنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

دوسرا روّیہ

مغربی تہذیب کو قبول کرلیا جائے

بعض مسلمان دانش وروں کی رائے یہ ہے کہ مغربی تہذیب کو قبول کرلیا جائے۔

مؤیدین کے دلائل

جو لوگ اس نقطۂ نظر کے حامی ہیں، ان کے دلائل کچھ اس طرح کے ہوتے ہیں:

۱۔ مغربی تہذیب کی برتری اور اہل مغرب کی قوت وشوکت اور بالادستی ایک ایسی واضح اور نمایاں حقیقت ہے جس کا انکار کیا ہی نہیں جا سکتا۔ علم وتحقیق میں ان کی پیش رفت، سائنس وٹیکنالوجی میں ان کا تفوق، ان کا معاشی استحکام اور ان کی جنگی قوت سب اس کا مظہر ہیں لہٰذا حقائق کو تسلیم اور قبول کرنا چاہیے۔ ان سے صرف نظر یا ان کا انکار بزدلی اور حماقت ہے جو نقصان دہ ہے، فائدہ مند نہیں۔

۲۔ جن اصولوں کو اپنا کر مغرب نے ترقی کی ہے، انہیں اپنا کر ہمیں بھی دنیا میں ترقی کرنی چاہیے کیونکہ اسلام دنیوی ترقی کا موید ہے، مخالف نہیں۔

۳۔ جن اصولوں کو اپنا کر مغرب نے ترقی کی ہے وہ اسلامی اصول ہیں، گویا اگر ہم مغربی تہذیب کے اصولوں کو قبول کرتے ہیں تو اسلامی اصولوں ہی کو قبول کریں گے۔

۴۔ اہل مغرب اپنی خوبیوں اور اچھے اعمال کی وجہ سے دوسری قوموں پر غلبے اور بالادستی کے مستحق ہیں۔ اگر ہم مسلمان بھی زمین میں قوت وشوکت چاہتے ہیں تو اس کا طریقہ یہی ہے کہ ہم بھی مغربی اصولوں پر عمل کریں خصوصاً سائنس و ٹیکنالوجی میں تفوق حاصل کریں جیسے جاپان اور جرمنی وغیرہ نے حاصل کیا ہے اور قوموں کی دوڑ میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کیا ہے۔

۵۔ خدانخواستہ ہم مسلمانوں کو یہ تو نہیں کہہ رہے کہ عیسائی ہو جاؤ بلکہ مسلمان رہتے

ہوئے بھی اور نماز روزے کی پابندی کرتے ہوئے بھی ہم ان مغربی اصولوں کی پیروی کر کے دنیا میں ترقی کر سکتے ہیں، جن پر عمل کر کے اہل مغرب نے ترقی کی ہے۔

اس رویے کے بارے میں ہمارا نقطۂ نظر

ہماری رائے میں یہ نقطۂ نظر کہ مسلمانوں کو مغربی تہذیب قبول کر لینی چاہیے، غلط ہے۔ دلائل اس کے وہی ہیں جو پچھلے مبحث میں مغربی تہذیب کو رد کرنے والے موقف کی حمایت میں دیے گئے ہیں اور جنہیں ہم درست سمجھتے ہیں۔ تاہم اپنے موقف کی تائید مزید کے لیے ہم اس موضوع پر دو پہلوؤں سے گفتگو کریں گے۔ ایک تو ہم اپنے قارئین کو یہ بتائیں گے کہ اگر مسلمانِ مغربی تہذیب کو قبول کر لیں تو اس کے نتائج کیا نکلیں گے اور دوسرے مغربی تہذیب کو قبول کر لینے کے حامی اصحاب کے دلائل کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے یہ دیکھیں گے کہ ان میں کتنا وزن ہے؟

مغربی تہذیب کو قبول کرنے کے نتائج

جب بھی دو فریق کوئی معاہدہ کریں یا ایک فریق دوسرے کی بات مانے مثلاً عورت اور مرد نکاح میں ایک دوسرے کو قبول کریں یا تجارت میں کوئی چیز خریدنے یا بیچنے کی بات ہو یا جنگ میں شکست خوردہ فریق غالب فریق کی شرائط قبول کرے یا ایک مرید اپنے مرشد کی اطاعت قبول کرے، غرض اس طرح کی ہر قبولیت کے کچھ نتائج نکلتے ہیں تو اسی طریقے سے اگر مسلمان مغربی تہذیب کو قبول کریں گے تو اس کے بھی کچھ نتائج لازماً نکلیں گے۔ ہمارے نزدیک یہ نتائج مندرجہ ذیل ہوں گے: ۱۔ تحسین ۲۔ مرعوبیت ۳۔ مکمل پیروی

مطلب یہ کہ جب آپ مسلمان ہوتے ہوئے مغربی تہذیب کو قبول کرنے کا فیصلہ کریں گے تو اس کا پہلا نتیجہ یہ نکلے گا کہ آپ مغربی تہذیب کو تحسین کی نظر سے دیکھنے لگیں گے۔ دیکھیے! دیکھنا بھی کئی طرح کا ہوتا ہے۔ اگر آپ کسی چیز کو تنقیدی نظر سے دیکھیں تو اس کی خرابیاں نمایاں ہو کر سامنے آئیں گی۔ اگر آپ اسے تجزیاتی نظر سے

دیکھیں گے تو خوبیاں اور خامیاں دونوں نظر آئیں گی۔ اسی طرح اگر آپ کسی چیز کو تحسین کی نظر سے دیکھیں گے تو اس کی خرابیاں بھی آپ کو خوبیاں نظر آئیں گی اور چھوٹی چھوٹی خوبیاں بڑی بڑی خوبیاں نظر آئیں گی۔ لیلیٰ کالی تھی لیکن اگر آپ قیس (مجنوں) کی نظر سے دیکھیں تو وہ دنیا کی سب سے حسین عورت تھی۔ اسی طرح جب آپ مغربی تہذیب کو بنظر تحسین دیکھیں گے تو اس کی چھوٹی چھوٹی خوبیاں آپ کو بڑی بڑی خوبیاں نظر آئیں گی اور اس کی خرابیوں پر آپ کی نظر ہی نہیں پڑے گی۔ اور اگر کوئی آپ کو ان کی طرف متوجہ کرے تو پھر بھی وہ خرابیاں آپ کو خوبیاں ہی لگیں گی یا بڑی بڑی خرابیاں معمولی لگیں گی یا آپ ان کی تاویل کر کے ان خرابیوں کا جواز فراہم کرنے کی کوشش کریں گے۔

اس قبولیت کا دوسرا نتیجہ مرعوبیت ہوتا ہے۔ ایک دیہاتی کو آپ حبیب بینک کراچی کی بلڈنگ کے نیچے لا کھڑا کیجیے تو وہ اتنی اونچی بلڈنگ دیکھ کر مرعوب ہو جائے گا۔ پنجاب کے ایک سابق گورنر نے لاہور کے گورنر ہاؤس کو بچوں کے لیے کھول دیا تھا۔ ایک بچہ جب گورنر ہاؤس کے ماحول (ہر جگہ باوردی سپاہی، عالی شان بلڈنگ، کاریں، فرنیچر، مودب کھڑے ملازمین، ہر چیز اعلیٰ و شاندار) کو دیکھے گا تو اس کا مرعوب ہونا فطری ہے۔ ایک معمولی چپراسی یا کلرک کو آپ اچانک صدر مملکت کے پاس لے جایئے تو وہ گنگ ہو جائے گا، ممکن ہے وہ مرعوبیت کے پیش نظر بول ہی نہ سکے اور اپنا نام بھی نہ بتا سکے۔ اسی طرح ایک مسلمان جب اپنے معاشرے میں دیکھتا ہے کہ لوگوں کو پیٹ بھر کھانا نہیں ملتا، پہننے کو کپڑے اور رہنے کو مکان نہیں، سیاست دان ملک کو لوٹتے ہیں، گورنمنٹ ملازم کام چور اور رشوت خور ہیں ...... وغیرہ وغیرہ اور اس کے مقابلے میں جب وہ مغرب کی سہولتوں اور آسائشوں بھری زندگی اور وہاں کے لوگوں کو محنت اور نظم و ضبط کے ساتھ کام کرتے دیکھتا ہے تو وہ مرعوب ہو جاتا ہے۔

اس تحسین اور مرعوبیت کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ مغربی تہذیب کی

پیروی شروع کر دیتا ہے۔ وہ سوچتا ہے ہمارا مسلم معاشرہ ساری خرابیوں کی جڑ ہے۔ یہاں کیا ہے: چوری، بے ایمانی، دغا بازی، بھوک، ننگ اور افلاس۔ اور مغربی معاشرے کی کیا بات ہے؟ صفائی ستھرائی، عمدہ کھانا پینا، تنخواہیں زیادہ، کار، کوٹھی غرض دنیا کی ہر نعمت یہاں موجود ہے۔ بقول اقبال ؎

فردوس جو تیرا ہے کسی نے نہیں دیکھا
افرنگ کا ہر قریہ ہے فردوس کی مانند

یوں زوال پذیر مسلم تہذیب اور معاشرے کا فرد مغرب کی غالب تہذیب اور تعلیمی، مالی، سیاسی لحاظ سے مستحکم مغربی معاشرے کے لائف اسٹائل کی پیروی شروع کر دیتا ہے اور اسے یہ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملتا کہ دونوں تہذیبوں کے اصولوں اور اساسات میں کتنا بنیادی فرق ہے اور بالآخر دنیا و آخرت میں اس کا نتیجہ کتنا تباہ کن نکلے گا؟

اس تمہید کے بعد آیئے اب ذرا ان دلائل کا ایک ایک کر کے جائزہ لیں جو مغربی تہذیب کو قبول کرنے کا مشورہ دینے والے بعض مسلمان دانش ور پیش کرتے ہیں:

۱۔ مغربی تہذیب کی برتری کی حقیقت کو تسلیم کر لیا جائے

مغربی تہذیب کو قبول کرنے کا مشورہ دینے والوں کی ایک دلیل یہ ہے کہ مغربی تہذیب کی برتری کی حقیقت کو تسلیم کر لیا جائے۔ لیکن کسی شے کی حقیقت کو تسلیم کرنا اور چیز ہے جبکہ اسے قبول کرنا اور اس کی پیروی کرنا امر دیگر ہے۔ کسی چیز کی حقیقت کو تسلیم کرنے کا ہرگز یہ لازمی نتیجہ نہیں ہے کہ اسے قبول کر لیا جائے اور اس کی پیروی شروع کر دی جائے۔ یہ محض ایک نفسیاتی مغالطہ ہے جسے ہم چند مثالوں سے واضح کریں گے۔ مثلاً یہ ایک حقیقت ہے کہ جب نبی کریم ﷺ پر وحی اتری اور آپؐ نے اسلام کا پرچار شروع کیا تو آپؐ ایک انتہائی کمزور فریق تھے اور اس کے مقابلے میں کفارِ مکہ ایک بہت مضبوط فریق تھے۔ اس حقیقت کو آنحضرت ﷺ خوب سمجھتے تھے، کفار کا دباؤ اور ان کی زیادتیاں برداشت کرتے تھے لیکن ایک لمحے کے لیے بھی آپؐ کبھی ان سے

مرعوب نہیں ہوئے، اپنا موقف نہیں چھوڑا، ان کے موقف کو کبھی تسلیم نہیں کیا اور کبھی ان کی پیروی کا سوچا بھی نہیں۔

اسی طرح یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی توفیق اور مدد سے آنحضرت ﷺ کو اپنی دعوت میں کامیابی ملی اور مدینہ میں چھوٹی سی اسلامی ریاست قائم ہوگئی۔ جو ابھی نوخیز تھی اور سیاسی، معاشی اور معاشرتی لحاظ سے بھی زیادہ مستحکم نہ تھی اور اس وقت کی سپر پاورز (روم اور ایران) کے مقابلے میں اس کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ ان حقائق کا نبی کریم ﷺ کو خوب ادراک تھا لیکن اس کا مطلب آنجنابؐ نے کبھی یہ نہیں سمجھا کہ ان سپر پاورز سے مرعوب ہوا جائے یا اپنا موقف چھوڑ کر ان کا موقف اپنا لیا جائے یا ان کی پیروی شروع کردی جائے بلکہ الٹا آپؐ نے ان کے موقف کی تغلیط کرتے ہوئے انہیں اسلام کی طرف باقاعدہ دعوت دی اور ان کا ہر سطح پر مقابلہ کیا۔ جنگ موتہ میں ان سے آمنا سامنا ہوا اور اس کا متوقع نتیجہ بھی دوسروں کے ساتھ آنجناب ﷺ کے سامنے تھا۔ اس کے باوجود بعد ازاں آپؐ ان کے مقابلے کے لیے نکلے اور سرحدی علاقے تبوک تک پہنچے۔ یہ الگ بات ہے کہ عملاً جنگ کی نوبت نہ آئی۔ آنجنابؐ کے بعد آپؐ کے تربیت یافتہ ساتھیوں (خلفائے راشدین) نے اسی پالیسی کو جاری رکھا اور چند سالوں کے اندر یہ سپر پاورز ان کے گھوڑوں کے سموں تلے روندی گئیں حالانکہ ان سپر پاورز کی فوج زیادہ تھی، اسے اسلحی برتری حاصل تھی، علاقہ بھی ان کا تھا، وہ معاشی طور پر بھی مستحکم تھیں غرض دنیوی اسباب اور ظاہر بین نظروں کے لحاظ سے مدینے کی چھوٹی سی اسلامی ریاست کا ان سے کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا لیکن خلفائے راشدین نے ان حقائق کا ادراک کرنے کے باوجود کبھی ایک لحظے کے لیے بھی یہ نہیں سوچا کہ روم و ایران سے مرعوب ہوا جائے یا ان کی پیروی کی جائے یا اپنا موقف چھوڑ کر ان کا موقف اپنا لیا جائے۔

اپنے ہاں کی مثال لے لیجیے۔ کیا برصغیر کے مسلمانوں، قائداعظم اور تحریک

پاکستان کے دیگر قائدین کو اس حقیقت کا ادراک نہ تھا کہ ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں سے زیادہ ہے۔ وہ ان کے مقابلے میں ایک مضبوط تر فریق ہیں اور کیا انہیں برطانیہ عظمیٰ کی حکومت اور اس کی طاقت وشوکت کا پتہ نہ تھا لیکن انہوں نے ان حقائق کو جاننے، سمجھنے اور ان کا ادراک رکھنے کے باوجود؛ اور انگریز اور ہندو کی مخالفت کے علی الرغم، پاکستان کے قیام کا مطالبہ نہ صرف اٹھایا بلکہ اسے منوا کر چھوڑا۔ اگر وہ سوچتے کہ ہم کمزور فریق ہیں، ہمیں انگریزوں اور ہندوؤں کی بات مان لینا چاہیے اور اپنا موقف چھوڑ دینا چاہیے تو کیا پاکستان کبھی وجود میں آ سکتا تھا؟

آپ اپنے معاشرے میں دیکھتے ہیں کہ ایک جاگیردار کسی غریب ہاری کی بیٹی اغوا کر لیتا ہے۔ اب حقیقت تو یہ ہے کہ جاگیردار طاقتور ہے، بارسوخ ہے، امیر ہے اور اس کے مقابلے میں غریب ہاری کی کوئی حیثیت نہیں۔ آپ اپنے آپ کو اس غریب ہاری کی جگہ رکھ کر سوچیں کہ آپ کیا محسوس کریں گے، اگر کوئی آپ سے کہے کہ آپ ان حقائق کو مدنظر رکھیں اور جاگیردار کے خلاف نہ بولیں، اس کے خلاف مقدمہ درج نہ کروائیں، تھانے کچہری نہ جائیں، شور نہ کریں بلکہ خاموشی سے اس کے ظلم کو برداشت کر لیں کیونکہ حقائق کا تقاضا یہی ہے؟

یہ ساری مثالیں ہم نے اس لیے دی ہیں کہ ہمارے قارئین پر مذکورہ موقف کا لغو ہونا واضح ہو جائے اور وہ یہ سمجھ لیں کہ زمینی حقائق کو سمجھنے، تسلیم کرنے اور ان کا ادراک کرنے کا لازمی نتیجہ یہ نہیں ہوتا کہ انہیں تسلیم بھی کر لیا جائے اور ان کے مقابلے میں اپنے موقف سے دست بردار بھی ہو جایا جائے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ مغربی تہذیب اس وقت دنیا کی برتر اور غالب تہذیب ہے، ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اہل مغرب اس وقت ہم سے زیادہ قوت اور طاقت وشوکت رکھتے ہیں لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر دی ہوئی مثالوں سے واضح کیا کہ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم یہ بھی تسلیم کر لیں کہ مغربی تہذیب ایک عمدہ اور صالح تہذیب ہے اور ہمیں اس کے اصول ومظاہر کی پیروی کرنی

چاہیے اور اس کے مقابلے میں اپنی تہذیب، اپنی ثقافت، اپنی فکر اور اپنے اصولوں کو چھوڑ دینا چاہیے۔

۲۔ مغرب کی پیروی دنیوی ترقی کی ضامن ہے

یہ رائے اور اصول بھی کہ ''مسلمانوں کو اس لیے مغرب کی پیروی کرنی چاہیے کہ مغرب نے اپنے اصولوں پر عمل کر کے دنیا میں ترقی کی ہے اور اس سے اپنی قوت وشوکت کا اہتمام کیا ہے لہٰذا اگر مسلمان بھی دنیا میں ترقی کرنا چاہتے ہیں تو انہیں بھی چاہیے کہ مغرب کے اصولوں اور اس کی تہذیب کی پیروی کریں تاکہ وہ بھی دنیا میں ترقی کرسکیں'' کوئی وزن نہیں رکھتا اور یہ بہت سی غلط فہمیوں اور غلط تصورات کا نتیجہ ہے جن میں سے چند اہم کا ہم یہاں مجملاً ذکر کریں گے:

۱۔ اس سلسلے میں سوچنے کی پہلی بات یہ ہے کہ قوموں کی ترقی وعروج کے اصول کیا ہیں؟ اور جن اصولوں پر عمل کر کے ایک قوم اور تہذیب ترقی کرتی ہے، کیا دوسری قومیں اور تہذیبیں بھی انہی اصولوں پر عمل کر کے اور اس تہذیب کی پیروی اور نقل کر کے ترقی کرسکتی ہیں؟

دنیا میں جن قوموں اور تہذیبوں نے ترقی کی ہے ان کے احوال اور قرآن و سنت کی تعلیمات کے مطالعے سے یہ بات ہمارے سامنے آتی ہے کہ دنیا میں قوموں کی ترقی و غلبے کا انحصار اس امر پر ہوتا ہے کہ پوری قوم اور معاشرہ کسی ایک عقیدے اور نظریے پر ایمان لے آئے، اسے صحیح مان لے، اس سے محکم وابستگی اختیار کرلے، اسے اپنی زندگیوں میں نافذ کرلے، اس کی خاطر جان و مال کی قربانی دینے پر آمادہ ہو جائے تو یہ وابستگی اسے وہ قوت محرکہ عطا کرتی ہے اور اس کے اندر ایسی خوبیوں کو جنم دیتی ہے جو دنیا میں اس کی ترقی کا سبب بنتے ہیں۔ اب اگر یہ عقیدہ اور نظریہ صالح ہو تو یہ ترقی انسانیت کے لیے مفید اور تعمیری ثابت ہوتی ہے اور ترقی کا یہ سفر اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کہ وہ قوم اس عقیدے اور نظریے سے عملاً محکم طور پر وابستہ رہے۔

البتہ جب وہ اس نظریے پر عمل چھوڑ دیتی ہے اور اس کی وابستگی اس سے کمزور پڑ جاتی ہے تو وہ قوم ان بنیادی اوصاف سے محروم ہونا شروع ہو جاتی ہے جو ترقی کے لیے ضروری ہیں اور یوں وہ بتدریج زوال کا شکار ہو جاتی ہے۔ اور اگر وہ عقیدہ اور نظریہ جس پر کوئی قوم ایمان لائی ہے اگر بذاتہ صالح اور تعمیری نہ ہو تو اس سے محکم وابستگی کے نتیجے میں اس کے اندر وہ بنیادی اوصاف تو ضرور پیدا ہو جائیں گے جو ترقی کے لیے ناگزیر ہیں لیکن وہ ترقی کے اس سفر کو بہت دیر تک جاری نہیں رکھ سکے گی کیونکہ غلط عقیدے اور نظریے کی وجہ سے وہ جلد ہی فساد فی الارض کا سبب بن جائے گی اور یوں اس کی ترقی کا سفر اختتام کو پہنچ جائے گا۔[1]

اب جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ ایک زوال پذیر قوم ایک طاقتور قوم کی پیروی کر کے دنیا میں ترقی کر سکتی ہے یا نہیں؟ تو اس کا انحصار اس امر پر ہے کہ اگر یہ دوسری قوم اس عقیدے اور نظریے کو دل سے تسلیم کر لے اور اس کے ساتھ محکم وابستگی اختیار کر لے جس کے ساتھ وابستگی کے نتیجے میں پہلی قوم نے ترقی کی ہے تو اس میں بھی لازماً وہ خوبیاں پیدا ہو جائیں گی جو ترقی کے لیے ضروری ہیں۔ مثلاً شمالی امریکہ میں کینیڈا اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے ایک عقیدے اور نظریے (جو مجموعہ ہے ہیومنزم، لبرلزم اور سیکولرزم ...... وغیرہ کا اور جو ایک مخصوص ملحدانہ ورلڈ ویو رکھتا ہے) سے محکم وابستگی اور اس پر عمل کی بنا پر ترقی کی۔ اب یورپ میں جرمنی اور براعظم ایشیا میں جاپان نے امریکیوں کے ورلڈ ویو اور نظریہ حیات کو دل سے من وعن قبول کر لیا، اسے اپنا لیا اور اس کی پیروی کی تو نتیجتاً ان میں بھی وہ خوبیاں پیدا ہو گئیں جو ترقی کے لیے ضروری ہیں اور انہوں نے عملاً ترقی کر لی جیسا کہ ہم بچشم خود اس کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ اس کے برعکس ترکی نے جرمنی اور جاپان سے بہت پہلے ترقی یافتہ مغربی ممالک

۱۔ اس اصول کے تفصیلی مطالعے کے لیے دیکھیے ہماری کتاب ''مسلم نشاۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل''، کتاب سرائے، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور۔

اور مغربی تہذیب کی پیروی شروع کی لیکن وہ آج تک دنیاوی ترقی کر کے عروج کی منزل تک نہیں پہنچ سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ترکی معاشرہ یورپ اور امریکہ کے نظریۂ حیات اور ورلڈ ویو پر دل سے ایمان نہیں لاسکا اور نہ اس کے تقاضوں پر کماحقہ عمل کر سکا کیونکہ وہ پہلے سے ایک عقیدے اور ایک نظریۂ حیات (اسلام) پر ایمان لائے ہوئے تھا جو اپنی کنہ میں اس مغربی ورلڈ ویو اور نظریۂ حیات سے مختلف بلکہ اس کی ضد تھا۔ نتیجتاً ترکی معاشرے میں وہ خوبیاں پروان نہ چڑھ سکیں جو ترقی کی ضامن ہیں اور ترقی کا سبب بنتی ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان ترک معاشرہ آج بھی امریکہ اور یورپ کی طرح ترقی یافتہ نہیں ہے بلکہ دیگر مسلمان اور ترقی پذیر ممالک کی طرح پسماندہ ہی ہے یہاں تک کہ یورپی یونین اسے اپنی یونین کی رکنیت دینے کے لیے تیار نہیں ہے کیونکہ وہ اس کے معیارِ تہذیب وترقی پر پوری نہیں اترتا۔

اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ ایک ترقی یافتہ قوم اور تہذیب کی پیروی کا لازمی نتیجہ ترقی اور عروج نہیں ہوتا بلکہ اس کا نتیجہ صرف اس وقت ترقی اور عروج ہوتا ہے جب کوئی کمزور قوم اس ترقی یافتہ قوم/تہذیب کے نظریۂ حیات اور ورلڈ ویو پر دل و جان سے ایمان لائے اور اس کے تقاضوں کے مطابق عمل کرے۔ لہٰذا ایک مسلمان ملک اگر ہزار سال بھی مغربی تہذیب کی پیروی کرتا رہے تو وہ ترقی نہیں کر سکے گا کیونکہ اس ملک کے مسلمان عوام مغربی تہذیب کے ورلڈ ویو اور نظریۂ حیات کو صحیح سمجھ کر اس پر دل و جان سے ایمان نہیں لائیں گے اور نہ اس کے تقاضوں پر عمل کریں گے۔ نتیجتاً ان کے اندر وہ خوبیاں پیدا ہی نہیں ہوں گی جو ترقی کے لیے ضروری ہیں لہٰذا وہ غریب اور پسماندہ ہی رہیں گی۔

یاد رکھیے کہ اگر مسلمان دنیا میں ترقی کرنا چاہتے ہیں تو اس کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں: ایک یہ کہ وہ اپنا عقیدہ، نظریۂ حیات اور ورلڈ ویو چھوڑ دیں اور مغرب کا نظریۂ حیات اور ورلڈ ویو سو فیصد دل سے قبول کر لیں، اپنا لیں، اس سے محکم وابستگی اختیار

کرلیں، اس کے تقاضوں پر عمل کریں تو پھر وہ لاریب امریکہ اور یورپ کی تقلید کرتے ہوئے دنیا میں کامیاب ہوجائیں گے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اپنے اس عقیدے، نظریۂ حیات اور ورلڈ ویو سے حقیقی اور محکم وابستگی اختیار کرلیں جس پر وہ پہلے سے ایمان لائے ہوئے ہیں اور اس کے تقاضوں پر عمل کریں تو پھر ان کے اندر وہ خوبیاں پیدا ہوجائیں گی جو ترقی اور عروج کا سبب بنتی ہیں اور جس کا تجربہ عملاً وہ اس سے پہلے کرچکے ہیں۔

اب اس کا فیصلہ مسلم امت اور اس کا اجتماعی ضمیر اور دانش ہی کرسکتی ہے کہ اس کے لیے اسلام پر عمل کرنا آسان ہے یا اسلام کو چھوڑ کر مغرب کے ہیومنزم، لبرلزم اور سیکولرزم وغیرہ پر عمل کرنا اس کے لیے زیادہ آسان ہے۔ ہمارا مطالعہ، تجربہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ مسلمان اپنا نظریۂ حیات چھوڑ کر کبھی بھی اسلام سے متصادم کسی دوسرے نظریۂ حیات کو قبول نہیں کرسکتے لہٰذا مسلمان امت کبھی بھی اسلام کے علاوہ کسی دوسرے نظریے کی حامل قوم رتہذیب کی پیروی کرکے دنیاوی ترقی نہیں کرسکتی۔ معاف کیجیے گا یہ موقف تو ہم نے اس وقت بھی قبول نہیں کیا تھا جب انگریز نے ہمارا ملک فتح کرلیا تھا اور ہمیں غلام بنالیا تھا۔ اس وقت بھی انگریز حکومت کے زیر نگرانی وزیر سرپرستی مغربی ممالک کے مشنری اور پادری اس ملک پر ٹوٹ پڑے تھے اور انگریزوں نے درپردہ پوری کوشش کی کہ مسلمان عیسائی ہوجائیں لیکن ہندوستانی مسلمانوں نے یہ ہرگز گوارا نہ کیا۔ بڑے بڑے مناظرے ہوئے، بحثیں ہوئیں، بائبل کے ترجمے چھپے، پریس قائم کیے گئے، ہسپتال کھولے گئے، سکول تعمیر کیے گئے، نوکریاں دینے کا لالچ دیا گیا لیکن شکست خوردہ اور کچلے اور پسے ہوئے ہندوستانی مسلمانوں نے ساری مشکلات اور مصیبتیں جھیلیں لیکن وہ اپنا عقیدہ بدلنے پر تیار نہ ہوئے تو آج، جبکہ حالات اس کے مقابلے میں بہت بہتر ہیں، کیسے یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ مسلمان اپنا نظریۂ حیات چھوڑ کر مغربی نظریۂ حیات اپنا لیں گے؟ مسلمانوں کے دین کو تبدیل کرنے کی اس کوشش میں ناکامی کے بعد ہی انگریز نے یہ پالیسی اپنائی تھی کہ ہم ہندستانیوں کو

عیسائی تو نہیں بنا سکے، اب تعلیم کے ذریعے ایسا سلو پائزن (میٹھا زہر بتدریج) ان کے نفوس میں داخل کیا جائے کہ یہ آہستہ آہستہ برائے نام مسلمان رہتے ہوئے ہماری تہذیب و ثقافت کے رسیا ہو جائیں اور اپنی اس سازش میں وہ کامیاب ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ آج مسلمانوں میں ایک معتد بہ تعداد ان لوگوں کی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ہمیں ترقی کرنے کے لیے مغربی تہذیب کی پیروی کرنی چاہیے۔ لیکن مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت آج بھی اسلام سے شدید جذباتی وابستگی رکھتی ہے اور وہ اسلام کی قیمت پر مغربی تہذیب کی پیروی کرنے کے لیے تیار نہیں۔

اسلام بلاشبہ دنیاوی ترقی و کامیابی کا مؤید اور خواہاں ہے لیکن اس سے بھی اہم تر بات یہ ہے، اور یہ اس کی تعلیمات کی بنیاد و اساس ہے اور اس کے ورلڈ ویو کا ناگزیر حصہ اور جزوِ لاینفک ہے، کہ وہ آخرت کی ترقی و کامیابی کو دنیا کی ترقی و کامیابی پر ترجیح دیتا ہے، اسے اہم تر گردانتا ہے اور مغرب کا ترقی و کامیابی کا تصور آخرت کی ترقی و کامیابی سے صرفِ نظر کرتا ہے، اسے اہمیت نہیں دیتا۔ تو اس صورت میں جب ہمارا دنیاوی ترقی کا تصور رماڈل مغرب کے دنیاوی ترقی کے تصور رماڈل سے اپنی بنیاد ہی میں مختلف ہے تو ہم دنیاوی ترقی کے لیے مغرب کی پیروی کیسے کر سکتے ہیں؟ اس بنیادی فرق کے علاوہ ترقی کے اسلامی اور مغربی ماڈل میں کئی دوسرے اختلافات بھی ہیں جو مندرجہ ذیل جدول سے ظاہر ہیں:

دنیاوی ترقی کا اسلامی ماڈل	دنیاوی ترقی کا مغربی ماڈل
۱۔ دنیا و آخرت دونوں میں ترقی و کامیابی	۱۔ صرف دنیاوی ترقی و کامیابی
۲۔ آخرت کی ترقی و کامیابی کو دنیاوی ترقی و کامیابی پر ترجیح	۲۔ دنیاوی ترقی کو آخرت کی ترقی و کامیابی پر ترجیح
۳۔ دنیاوی ترقی و کامیابی، اللہ و رسول کی اطاعت کرتے ہوئے	۳۔ دنیاوی ترقی و کامیابی اللہ و رسول کی مخالفت کرتے ہوئے

مندرجہ بالا سے صاف ظاہر ہے کہ دنیاوی ترقی کا مغربی تصور اور ماڈل، ترقی و کامیابی کے اسلامی تصور اور ماڈل کے بالکل الٹ اور اس کی ضد ہے لٰہذا مسلمان مغرب کی پیروی کر کے دنیا میں ترقی کر ہی نہیں سکتے۔ اور اگر وہ ایسی کوشش کریں گے تو اس کے نتیجے میں بجائے ترقی کے مزید پسماندگی و تنزلی کا شکار ہوں گے کیونکہ اس سے ان کے حقیقی تصور ترقی کو یقیناً گزند پہنچے گی۔ یہ مندرجہ بالا حقائق کا منطقی اور ریاضیاتی نتیجہ ہے جس سے مفر ممکن ہی نہیں اور تجربے اور مشاہدے نے اس نتیجے کی حقانیت کو عین الیقین بنا دیا ہے بشرطیکہ مسلمان کھلی آنکھوں سے دیکھیں، کھلے ذہن سے تجزیہ کریں اور کھلے دل سے اس کے نتائج کو قبول کریں۔

پھر یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ اسلام صرف دنیاوی ترقی و کامیابی کا مؤید و خواہاں ہی نہیں اس کا طریقہ اور راستہ بھی بتاتا ہے بلکہ اس کی ضمانت بھی دیتا ہے۔ اور وہ راستہ ہے اللہ کی غیر مشروط اور کما حقہ اطاعت کا۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ" (الانبیاء ۲۱: ۱۰۵) یعنی کوئی نئی بات نہیں ہم اپنے صحیفوں میں شروع ہی سے کہتے چلے آ رہے ہیں کہ زمین کا اقتدار صرف اللہ کے صالح بندوں کے لیے ہے۔ مطلب یہ کہ اے مسلمانو! اللہ کے نیک اور صالح بندے بن جاؤ تو تمہیں زمین میں اقتدار ملے گا۔ نوٹ کیجیے کہ صرف ایک یا چند افراد کے نیک بننے کی بات نہیں ہو رہی بلکہ سب (یعنی معاشرے کی اکثریت) کے نیک اور صالح بننے کی بات ہو رہی ہے۔ اسی لیے عباد یعنی جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا ۝ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُم مِّدْرَارًا ۝ وَيُمْدِدْكُم بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَيَجْعَل لَّكُمْ جَنَّاتٍ وَيَجْعَل لَّكُمْ أَنْهَارًا ۝ مَّا لَكُمْ لَا تَرْجُونَ لِلَّهِ وَقَارًا ۝ (نوح ۷۱: ۱۰-۱۳) یعنی اگر تم اللہ کے سچے بندے بن جاؤ، اس سے مغفرت چاہو، اسے اپنا ملجا و ہادی سمجھو تو زمین

اپنے خزانے تم پر اگل دے گی اور آسمان تم پر نعمتوں کی بارش کر دے گا اور تم ترقی و کامیابی سے ہمکنار ہو جاؤ گے۔

آپ دیکھ لیجیے دونوں جگہ (قرآن حکیم میں یہ مضمون مزید کئی جگہ بھی بیان ہوا ہے) مسلمانوں کو ترقی و کامیابی اور غلبہ واقتدار کی ضمانت دی گئی ہے۔ (اور اللہ سے بڑھ کر سچی بات کس کی ہوسکتی ہے!) لیکن شرط یہ ہے کہ ہم بحیثیت مجموعی اور بحیثیت معاشرہ اللہ کی سچی اطاعت کے راستے پر گامزن ہو جائیں۔

تو کیا ہماری مت ماری گئی ہے کہ اللہ کہتا ہے کہ میرے سچے بندے بن جاؤ تو دنیا میں ترقی کرو گے اور ہم کہیں کہ نہیں ہم تو ترقی کے لیے آپ کی نہیں مغرب کی پیروی کریں گے، وہ اہل مغرب جو کہتے ہیں کہ خدا ایک عفریت ہے، خدا مر چکا ہے، خدا نہیں انسان مختار مطلق ہے[1] ہمیں الٰہی قوانین اور ہدایت کی ضرورت نہیں اور کوئی مستقل دینی اور اخلاقی اقدار نہیں ہوتیں[2] اور جن اہل مغرب کی زندگی کا سارا نظام خدا و آخرت کی نفی کی بنیاد پر چل رہا ہے۔ برایں عقل و دانش بباید گریست۔

۳۔ مغرب کی ترقی کے اصول عین اسلامی ہیں

یہ ایک اور بڑا مغالطہ ہے جس میں مسلمان عوام ہی نہیں ان کے بعض بڑے دانشور اور علماء (سرسید اور امیر علی سے لے کر ابوالکلام آزاد اور علامہ مشرقی تک) مبتلا ہیں۔ مغالطہ یہ ہے کہ مغرب نے جن اصولوں پر ترقی کی ہے وہ اسلامی اصول ہیں اور یہ کہ ہم نے اسلامی اصولوں پر عمل چھوڑ دیا ہے اور مغرب نے ان اصولوں کو اپنا لیا ہے۔ اس مفروضے سے جو منطقی نتائج نکلتے ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ Jean Paul Sartre, Existentialism as Humanism, p-284 (Tr. Philip Mairet) Routledge, London, 1997.

۲۔ Jean Paul Sartre, Being and Nothingness, p-122 Philosophical Library, New York, 1956.

۱۔ اہل مغرب اچھے اور صالح ہیں اس لیے انہوں نے ترقی کی ہے۔
۲۔ مسلمان برے اور غیر صالح ہیں اس لیے وہ ذلت اور پستی میں پڑے ہوئے ہیں۔
۳۔ لہٰذا مسلمان اگر ترقی کرنا چاہتے ہیں تو انہیں اہل مغرب کی پیروی کرنی چاہیے تاکہ وہ بھی اچھے اور صالح بن جائیں اور دنیا میں ترقی کر سکیں۔

یہ منطقی بات ہے کہ ایک غلط مفروضے کا نتیجہ ہمیشہ غلط اور منفی ہی نکلتا ہے، صحیح بات یہ ہے کہ دنیاوی ترقی اور خوشحالی کا کوئی تعلق اسلام اور غیر اسلام یا حق و باطل سے نہیں۔ اللہ مسلمانوں کو بھی رزق دیتا ہے اور غیر مسلموں اور کافروں کو بھی۔ وہ ان کو بھی رزق دیتا ہے جو ساری رات اس کی یاد میں جاگتے ہیں اور ان کو بھی رزق دیتا ہے جو ساری رات اسے گالیاں دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ سب کا رب ہے، اس کا نظام یہی ہے۔ اسے ایک مثال سے سمجھیے، فرض کیجیے ایک تاجر مسلمان ہو لیکن محنت نہ کرے، بداخلاق ہو، وقت پر اپنی دکان نہ کھولے، اس کی دکان میں سامان تھوڑا ہو، چیزیں مہنگی بیچے تو کیا وہ تاجر کامیاب ہوگا؟ کیا اس کی دکان چلے گی؟ اب اس کے ساتھ کی دکان اگر ایک کافر کی ہو لیکن وہ محنت کرے، وقت پر دکان کھولے، ہر قسم کا سامان اس کے پاس ہو، خوش اخلاق ہو اور منافع کم لے تو وہ یقیناً کامیاب ہوگا۔ اس کی دکان خوب چلے گی لیکن ساتھ والے مسلمان کی نہیں چلے گی۔ تو اس میں اسلام اور کفر کی کوئی بات نہیں۔ اللہ کا نظام یہ ہے کہ یہ دنیا دارالاسباب ہے جو ان اسباب کو استعمال کرنے کی بہتر صلاحیت رکھتا ہے وہ یہاں کامیاب ہو جائے گا۔ ہندو، عیسائی اور یہودی اس وقت اسباب دنیا مہیا کرنے کی زیادہ لیاقت رکھتے ہیں لہٰذا ان کی دکان کامیاب ہے۔ مسلمانوں نے ان کے مقابلے میں اسباب دنیا مہیا کرنے میں کم تر صلاحیت کا مظاہرہ کیا ہے لہٰذا ان کی دکان نہیں چل رہی۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ انسان میں وہ صلاحیت کیسے پیدا ہوتی ہے جو اسے اسباب دنیا مہیا کرنے کے قابل بناتی ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ وہ معروضی اور بنیادی انسانی اوصاف اور خوبیاں

(مثلاً محنت، تنظیم، پابندیٔ قانون، ایثار وغیرہ) جو دنیا میں ترقی کے لیے مطلوب ہیں وہ انسانوں میں کسی بھی نظریۂ حیات سے محکم وابستگی کے نتیجے میں پیدا ہو جاتی ہیں، خواہ وہ نظریہ سچا ہو یا جھوٹا، وہ وحی پر مبنی ہو یا انسانوں کی اپنی سوچ کا نتیجہ ہو۔ بس اس نظریۂ حیات سے سچی اور محکم وابستگی اس کی بنیادی شرط ہے۔ مسلمان جب اپنے نظریۂ حیات سے سچی اور محکم وابستگی رکھتے تھے تو ان میں بھی وہ معروضی اور بنیادی خوبیاں پیدا ہو گئی تھیں لٰہذا وہ دنیا میں کامیاب ہو گئے۔ جب اسلامی نظریۂ حیات سے ان کی وابستگی کمزور پڑ گئی تو ان میں وہ اوصاف ناپید ہو گئے اور وہ پسماندہ، کمزور اور زوال پذیر ہو گئے۔ اہل مغرب نے جب اپنے نظریۂ حیات سے مستحکم وابستگی اختیار کر لی تو ان کے اندر بھی وہ اوصاف بیدار ہو گئے جو دنیاوی ترقی کے لیے ضروری ہیں لٰہذا انہوں نے خوب دنیاوی ترقی کی۔ ان میں بھی یہ اوصاف اب کم اور کمزور ہو رہے ہیں لیکن ابھی ختم نہیں ہوئے لٰہذا وہ آج بھی دنیا میں ترقی کر رہے ہیں اور دنیاوی لحاظ سے کامیاب ہیں۔

لٰہذا یہ مفروضہ ہی سرے سے غلط ہے کہ اہل مغرب صالح اور نیک ہیں اس لیے وہ صاحب قوت وحشمت اور غالب وبالا دست ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ صالح اور نیک نہیں ظالم وجابر ہیں، بدطینت اور بدقماش ہیں، خودغرض اور سازشی ہیں، چور اور ڈاکو ہیں، بدکار اور حیوان ہیں بلکہ حیوانوں سے بھی بدتر ہیں اور مسلمانوں کے تو وہ بدخواہ اور جانی دشمن ہیں اور انہیں زندہ اور پھلتا پھولتا دیکھ ہی نہیں سکتے اور نہ مسلمانوں سے ان کی نفرت، دشمنی اور انتقام کے جذبات کسی سے چھپے ہوئے ہیں۔ ماضی میں انہوں نے مسلمان ممالک میں جو کچھ کیا ان کو غلام بنایا، قتل وغارت گری کا بازار گرم کیا اور وسائل لوٹے۔ ہندوستان میں انگریزوں نے جو کچھ کیا، فلسطین میں جو کچھ اہل یورپ ایک صدی سے کر رہے ہیں۔ کشمیر میں جو کچھ نصف صدی سے ہندو ان کی شہ اور مدد سے کر رہے ہیں، بوسنیا میں جو کچھ ہوا، چیچنیا میں جو کچھ روسی اہل مغرب کی معاونت اور مدد

سے کر رہے ہیں۔ اور اب حال ہی میں ہماری آنکھوں دیکھے جو مظالم اور قتل و غارت گری انہوں نے افغانستان و عراق میں کی ہے بلکہ اب بھی کر رہے ہیں۔ اور مسلم ممالک (سعودی عرب، کویت، عرب امارات اور وسط ایشیائی ریاستوں) وغیرہ کے مالی وسائل جس طرح وہ لوٹ رہے ہیں اور ان کے تیل و گیس کے چشموں پر قابض ہو چکے ہیں، اس کے بعد کوئی آنکھ اور عقل کا اندھا ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ صالح اور نیک ہیں اس لیے مستحق استخلاف فی الارض ہیں۔

یہ تو ہم مسلمانوں کے ساتھ ان کا اخلاقی رویہ ہے، خود ان کے اپنے اندر کے حالات بھی کسی سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ ہیومنزم، سیکولرزم، لبرلزم وغیرہ کے ذریعے انہوں نے اللہ کے حق ہدایت و اطاعت اور وحی کے سند ہونے سے انکار کیا۔ دنیا ہی کو سب کچھ مان کر مادہ پرستی اختیار کی، رسالت کے جامع تصور کا انکار کیا۔ یوں توحید، رسالت اور آخرت کے بنیادی تصورات کی نفی کرتے ہوئے انہوں نے انسان کی خدائی کا اعلان کر دیا اور اس وقت بھی وہ اسی پر ڈنکے کی چوٹ عمل کر رہے ہیں۔ مغرب میں خاندانی نظام تباہ ہو چکا ہے۔ بغیر نکاح عورت مرد کا مشترکہ زندگی گزارنا، عورتوں کی عورتوں سے اور مردوں کی مردوں سے شادی قانونی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ جوا، شراب اور زنا جیسے قبیح افعال کو انہوں نے قانون بنا کر حلال کر لیا ہے۔ لباس سکڑتے سکڑتے نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے۔ شرم و حیا اور عفت نام کی کوئی چیز اب مغرب میں باقی نہیں رہی۔ یہ ان کی معاشرت کا حال ہے۔ باقی سارے شعبہ ہائے زندگی کا حال بھی ایسا ہی ہے۔

ان ساری باتوں کو دیکھنے اور سمجھنے کے بعد کوئی عقل کا اندھا ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ اہل مغرب نیک اور صالح ہیں اور وہ اللہ کی پسندیدہ مخلوق ہیں لہٰذا وہ زمینی خلافت کے حق دار ہیں۔ کوئی مسلمان عقل و ہوش کے ساتھ تو یہ کہہ نہیں سکتا الا یہ کہ اس کی آنکھیں مغرب کی مصنوعی چکا چوند سے خیرہ ہو چکی ہوں اور وہ مغرب سے مرعوبیت کی ایسی منزل پر ہو کہ اسے کالا بھی سفید نظر آنے لگے۔

خلاصہ یہ کہ یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ مغرب نے اسلامی اصولوں پر عمل کر کے دنیا میں ترقی و کامیابی حاصل کی ہے لہٰذا ہمیں بھی مغرب کی پیروی کرنی چاہیے۔ بلکہ صحیح صورت یہ ہے کہ مغرب نے اپنے نظریۂ حیات سے محکم وابستگی کی وجہ سے دنیاوی ترقی کی ہے اور مسلمان اگر دنیا میں ترقی کرنا چاہتے ہیں تو اس کی واحد صورت یہی ہے کہ وہ بھی اپنے نظریۂ حیات سے محکم وابستگی اختیار کرلیں۔ اور بات صرف اتنی ہی نہیں بلکہ اس سے مربوط اگلی بات یہ ہے کہ مسلمانوں کا نظریۂ حیات (اسلام) اہل مغرب کے نظریۂ حیات (ہیومنزم، سیکولرزم، لبرلزم وغیرہ) سے بالکل الٹ ہے لہٰذا مسلمان اگر مغرب کی پیروی کریں گے تو ذہنی وفکری یکسوئی کے فقدان کی وجہ سے ان کی شخصیت مزید منتشر ہوکر الجھے گی اور وہ ترقی کی بجائے مزید تنزل اور پسماندگی کا شکار رہوں گے۔ لہٰذا ہر مسلمان کے ذہن میں یہ بات دو اور دو چار کی طرح واضح ہو جانی چاہیے کہ دنیا میں مسلمانوں کی ترقی کا واحد طریقہ یہ ہے کہ وہ سچے مسلمان بن جائیں اور یہ کہ اگر ترقی کے لیے وہ مغرب کی پیروی کریں گے تو وہ مزید ذلت اور رسوائی کا شکار رہوں گے۔

۴۔ سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کے بغیر دنیاوی کامیابی ممکن نہیں

پورا مفروضہ یہ ہے کہ مغرب کی ترقی کی وجہ سائنس وٹیکنالوجی ہے لہٰذا مسلمان بھی اگر دنیا میں ترقی کرنا چاہتے ہیں تو ناگزیر ہے کہ وہ بھی سائنس وٹیکنالوجی میں پیش رفت کریں۔ اور سائنس وٹیکنالوجی کی قیادت چونکہ اس وقت مغرب کے ہاتھ میں ہے لہٰذا مسلمان مجبور ہیں کہ وہ مغرب کی پیروی کریں تا کہ اس سے سائنس وٹیکنالوجی سیکھ سکیں۔ اس مفروضے کا اگلا حصہ یہ ہے کہ نہ صرف سائنس وٹیکنالوجی بلکہ مغرب نے جن اصولوں پر چل کر سائنس وٹیکنالوجی میں ترقی کی ہے، مسلمانوں کو بھی ان اصولوں پر عمل کرنا چاہیے تا کہ وہ بھی سائنس وٹیکنالوجی میں ترقی کرسکیں گویا اس کے لیے بھی مغرب کے اصولوں کی پیروی ناگزیر ہے۔

یہ مفروضہ بھی غلط تصورات اور غلط فہمیوں کا ایک پلندہ ہے اور اس کے کئی اجزا

ہیں۔ہم ان پر باری باری گفتگو کریں گے:

ا۔ یہ کہنا خلاف حقیقت ہے کہ سائنس وٹیکنالوجی خصوصاً انڈسٹر یلائزیشن قوموں کی ترقی کی واحد بنیاد ہے۔اس کا ثبوت یہ ہے کہ مسلمان ایک ہزار سال تک دنیا کی سپر پاور رہے ہیں جب ان کی تہذیب ساری تہذیبوں پر بالا دست تھی اور وہ علم وتحقیق اور سائنس وٹیکنالوجی سمیت سیاسی، معاشی، قانونی، معاشرتی اور دفاعی غرض ہر شعبہ حیات میں ساری دنیا سے آگے تھے لیکن ان کی اس کامیابی اور ترقی کی بنیاد سائنس وٹیکنالوجی پر نہیں تھی۔ یقیناً وہ سائنس وٹیکنالوجی میں بھی ساری دنیا سے آگے تھے لیکن ہم جو بات کہہ رہے ہیں وہ یہ ہے کہ ان کی ترقی کی بنیاد سائنس وٹیکنالوجی اور انڈسٹر یلائزیشن پر نہیں تھی۔اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سائنس وٹیکنالوجی اور انڈیسٹر یلائزیشن ترقی کی واحد بنیاد نہیں ہیں۔

۲۔ یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ مغرب کی ترقی کا بنیادی سبب سائنس وٹیکنالوجی اور انڈسٹر یلائزیشن میں اس کا تفوق ہے۔اگر چہ سطح بین نظروں کو بظاہر ایسا ہی دکھائی دیتا ہے لیکن اگر آپ ذرا غور کریں تو سمجھ جائیں گے کہ کسی قوم رتہذیب کی ترقی میں سائنس وٹیکنالوجی کے علاوہ دیگر بہت سے عوامل اہم تر کردار ادا کرتے ہیں۔

آپ یہ سوچیے کہ کیا کوئی قوم سائنسی ترقی کر سکتی ہے اگر اس کے ہاں تعلیم عام نہ ہو بلکہ اعلیٰ تعلیم کا بہترین انتظام نہ ہو، عمدہ تحقیقی ادارے اور لیبارٹریاں نہ ہوں، تحقیق کی حوصلہ افزائی نہ ہوتی ہو۔اور تعلیم وتحقیق کے اعلیٰ ادارے اور لیبارٹریاں اس وقت تک قائم نہیں ہوسکتیں جب تک اس قوم کی مالی حالت مستحکم نہ ہو اور وہ کھلے دل سے اس پر خرچ نہ کر سکے۔اور کوئی قوم اس وقت تک مالی طور پر مستحکم نہیں ہوسکتی جب تک اس کے ہاں سیاسی استحکام نہ ہو اور یہ سیاسی و مالی استحکام نتیجہ ہوتا ہے اس تہذیب رقوم کے افراد کے نظم وضبط کے خوگر ہونے کا، محنت کی عادت کا، قانون کی پیروی کا۔اور یہ سب خوبیاں افراد میں اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب وہ کسی نظریۂ حیات سے مستحکم طور پر

وابستہ ہوں اور وہ اس پر عمل اور اس کے غلبے کے لیے جان و مال اور وقت اور صلاحیتوں کی قربانی دینے کے لیے تیار ہوں۔

پس آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کسی قوم/تہذیب کی ترقی میں جو چیز فیصلہ کن ادا کرتی ہے وہ اپنے نظریۂ حیات کے ساتھ اس کی محکم وابستگی اور اس کے لیے ایثار و قربانی کا جذبہ ہے۔ یہ وہ نظریاتی اور اخلاقی منبع ہے جس سے اس قوم/تہذیب کے افراد میں وہ خصائص پیدا ہوتے ہیں جو قومی ترقی کا سبب بنتے ہیں۔

گویا قومی ترقی کی حقیقی بنیاد صرف ایک ہے اور وہ ہے یعنی انسان سازی، اس نظریۂ حیات کے مطابق جس میں وہ معاشرہ یقین رکھتا ہے۔ اس کے بغیر کسی ترقی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ پس کسی قوم کی ترقی میں سائنس و ٹیکنالوجی کا بلاشبہ ایک کردار ہوتا ہے لیکن جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں واضح کیا کہ یہ کردار ثانوی اور فرعی حیثیت رکھتا ہے اور بنیادی اہمیت رکھنے والے عوامل دوسرے ہیں۔ سائنس و ٹیکنالوجی کو ترقی کا بنیادی عامل گرداننے کا مطلب تو یہ ہے کہ ایک ایسا عامل جس کا قومی ترقی میں مثلاً سولھواں نمبر ہو آپ اسے اٹھا کر ایک نمبر پر لے آئیں تو ظاہر ہے یہ غلط ہے اور اس غلطی کا اظہار اور اقرار اس لیے ضروری ہے کہ اس غلط دعوے سے غلط نتائج اخذ ہوتے ہیں۔

۳۔ چلیے بحث کی خاطر ہم بطور مفروضہ ان لوگوں کا موقف تھوڑی دیر کے لیے صحیح تسلیم کر لیتے ہیں جو کہتے ہیں کہ آج کل ترقی کی بنیاد سائنس و ٹیکنالوجی اور انڈسٹریلائزیشن میں پیش رفت پر ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا سائنس و ٹیکنالوجی میں پیش رفت کا طریقہ یہ ہے کہ ہم سائنس و ٹیکنالوجی میں مغرب کی پیروی شروع کر دیں؟ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ اس سے زیادہ بے عقلی کی بات تو کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ اگر ہم سائنس و ٹیکنالوجی میں مغرب کی پیروی کریں گے تو محض ان کی ٹیکنالوجی کے استعمال کنندہ (end users) بن کر رہ جائیں گے اور کبھی اس میں تفوق حاصل نہیں کر سکیں گے جیسا کہ اس وقت پاکستان اور عالم اسلام میں ہو رہا ہے۔ آخر اس بات کو سمجھنے کے

لیے کتنی عقل و دانش کی ضرورت ہے کہ اگر ہم سائنس و ٹیکنالوجی میں آگے بڑھنا چاہتے ہیں تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے ملک میں سائنس کی اعلیٰ تعلیم و تحقیق کا بہترین انتظام کریں۔ عمدہ تجربہ گاہیں (لیبارٹریاں) بنائیں اور سائنس کی اعلیٰ تعلیم و تحقیق اور تجربہ گاہوں کے قیام کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان کاموں کے لیے وافر فنڈز مہیا کریں، ملک میں اعلیٰ تعلیم و تحقیق کا ماحول پیدا کریں اور نئی ایجادات اور انکشافات کی حوصلہ افزائی کریں۔ چونکہ اعلیٰ درجے کی سائنسی مہارت اور تجربات کے لیے کثیر سرمایہ اور بہترین افراد درکار ہوتے ہیں اس لیے اس تجویز پر غور کرنے میں کوئی حرج نہیں کہ ابتدا میں سارا عالم اسلام مل کر اپنی بہترین افرادی قوت اور مالی وسائل جمع کرے اور کسی ایک جگہ اعلیٰ پائے کی سائنسی تعلیم و تحقیق و تجربات کا انتظام کرے۔ یہ کام اعلیٰ علمی سطح پر ایک عرصے تک جاری رہے گا تو پھر جا کر کچھ نتائج نکلیں گے۔ لیکن اگر ہم سائنس و ٹیکنالوجی میں پیش رفت کا معیار یہی سمجھتے رہے کہ ہم اپنے سائنسدان اور ٹیکنالوجسٹ ترقی یافتہ مغرب میں بھیجتے رہیں جو وہاں کچھ عرصہ رہ کر ان کی سائنسی ایجادات اور ان کے طریق استعمال کو اچھی طرح سمجھ لیں اور پھر اپنے ملک واپس آ جائیں تو اس طرح تو ہم ساری زندگی مغرب کی پیروی ہی کرتے رہیں گے اور کبھی سائنس و ٹیکنالوجی میں خود کفیل نہیں ہوں گے اور نہ اس میں تفوق حاصل کر سکیں گے۔

خلاصہ یہ کہ اگر یہ بات مان بھی لی جائے کہ دنیوی ترقی کا انحصار سائنس و ٹیکنالوجی پر ہے تو بھی اس کا طریقہ یہ نہیں کہ مغرب کی پیروی کی جائے بلکہ اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ علم و تحقیق میں ترقی کر کے اور اس میں خود کفیل ہو کر سائنس و ٹیکنالوجی میں پیش رفت کی جائے۔

۴۔ یہ بات بھی سو فیصد غلط فہمی پر مبنی ہے کہ اگر ہم مسلمان سائنس و ٹیکنالوجی اور انڈسٹریلائزیشن میں ترقی کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں ان اصولوں پر عمل کرنا ہو گا جن اصولوں پر عمل کر کے مغرب نے سائنس و ٹیکنالوجی میں ترقی کی ہے۔ جیسا کہ ابھی اوپر ذکر ہوا کہ سائنس و ٹیکنالوجی میں ترقی کا انحصار ہوتا ہے سیاسی و معاشی استحکام پر اور

علم وتحقیق میں ترقی پر؛ اور سیاسی و معاشی استحکام اور علم وتحقیق میں ترقی کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ افرادِ قوم میں محنت، نظم وضبط، تنظیم ومنصوبہ بندی، اتحاد، پابندیٔ قانون، اطاعتِ قیادت اور ایثار وقربانی کا جذبہ ہو؛ اور افراد میں یہ خوبیاں پیدا ہوتی ہیں کسی نظریۂ حیات اور اجتماعی نصب العین کو مان کر اس پر شدت و یکسوئی کے ساتھ عمل کرنے سے۔ اب چونکہ اہل مغرب کا نظریۂ حیات (ہیومنزم، سیکولرزم، لبرلزم وغیرہ) مسلمانوں کے نظریۂ حیات (توحید، رسالت، آخرت وغیرہ) سے بالکل مختلف اور متضاد ہے لہٰذا جن اصولوں پر چل کر اہل مغرب نے ادارے بنائے ہیں اور ترقی کی ہے (مثلاً ان کی معیشت بہتر ہوئی ہے نظام سرمایہ داری سے، سود سے، منڈی کی معیشت سے، اور ان کا سیاسی نظام مستحکم ہوا ہے جمہوریت اور نیشنلزم سے اور ان کی تعلیمی ترقی کی بنیاد یہ ہے کہ علم کا منبع وحی نہیں بلکہ عقل وحس اور مشاہدہ وتجربہ ہیں۔) ان اصولوں اور ان اداروں کے ذریعے مسلمان ترقی نہیں کر سکتے بلکہ انہیں اپنے اصولوں کے مطابق اپنے ادارے بنانا ہوں گے اور اگر وہ سادہ لوحی اور حماقت سے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ مسلمان رہتے ہوئے ان مغربی اصولوں اور اداروں پر عمل کر کے ترقی کریں گے تو بیک وقت متضاد اصولوں پر عمل کرنے کی وجہ سے ان کی شخصیت الجھ جائے گی اور منتشر ہو جائے گی اور وہ ترقی کی بجائے پسماندگی، ضعف اور ذلت کے گڑھے میں مزید دھنستے چلے جائیں گے۔

۵۔ اسلامی اصولوں پر عمل کرتے ہوئے مغربی تہذیب کی پیروی ممکن ہے

سطور بالا میں ہم نے اس موضوع پر جو کچھ کہا ہے اس کے بعد ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ جو شخص اس بات کا مدعی ہو کہ ایک آدمی بیک وقت اسلام کی پیروی بھی کر سکتا ہے اور مغربی تہذیب کی بھی (جس طرح ماضی میں بعض لوگ کہتے تھے کہ ایک آدمی بیک وقت مسلمان بھی ہو سکتا ہے اور کمیونسٹ بھی) اس کے بارے میں ہماری حتمی رائے یہ ہے کہ وہ:

- یا تو اسلام کو نہیں سمجھتا
- یا مغربی تہذیب کو نہیں سمجھتا
- یا ان دونوں کو نہیں سمجھتا

کیونکہ یہ کہنا تو ایسے ہی ہے جیسے یہ کہا جائے کہ آگ اور پانی کا ملاپ ہو سکتا ہے یا روشنی اور اندھیرا اکٹھا ہو سکتے ہیں۔

اس لیے ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ایک مسلمان اسلامی اصولوں پر عمل کرتے ہوئے بھی مغربی اصولوں کے مطابق زندگی گزار سکتا ہے، اس کا فہم اسلام ناقص ہے جیسا کہ اقبال نے کہا ہے کہ۔

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

یا پھر یہ کہ۔

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی

کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ ایک شخص بیک وقت مسلمان بھی ہو سکتا ہے اور عیسائی بھی؟ یا ایک شخص بیک وقت مسلمان بھی ہو سکتا ہے اور ہندو بھی؟ اس کا جواب کوئی مسلمان ہاں میں نہیں دے سکتا کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اسلام کے اصول اور ہیں اور عیسائیت کے کچھ اور؛ اور ہندومت کچھ اور چیز ہے اور اسلام کچھ اور! بعینہ اسی طرح اسلام کے اصول کچھ اور ہیں اور مغربی تہذیب کے اور۔ ہم اس سے پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ مغربی تہذیب کے سارے بنیادی اصول الحاد پر مبنی ہیں۔ کانٹ کہتا ہے کہ خدا مر چکا ہے، سارتر کہتا ہے کہ خدا ایک عفریت ہے اور یہ کہ انسان خود قادر مطلق ہے اسے باہر کے کسی خدا کی ضرورت نہیں۔ فرائیڈ کہتا ہے کہ اصل مسئلہ جنس ہے اور جو شخص ہر قیمت پر اپنی جنسی خواہش پوری نہیں کرتا، وہ ذہنی مریض ہے۔ کارل مارکس کہتا ہے کہ اصل مسئلہ پیٹ ہے، رہا مذہب تو وہ افیون ہے۔ ڈارون کہتا ہے کہ انسان اصل میں

حیوان ہے۔تو انتہائی اختصار کے ساتھ عرض ہے کہ جس تہذیب کے عالی قدر مفکرین کی آراء یہ ہوں اسلام سے اس کا کیا واسطہ ہے؟ اور جو آدمی ایک پاؤں اسلامی تہذہب کی کشتی میں اور دوسرا پاؤں ایسی مغربی تہذیب کی کشتی میں رکھ کر سفر کرے تو اس کا انجام اس کے سوا کیا ہوسکتا ہے کہ وہ کفر کی ظلمتوں میں ڈوب جائے اور اس کے ایمانی وجود کی موت واقع ہو جائے۔

تو کیا ہم عیسائیت کو اس لیے رد کرتے ہیں کہ وہ غلط مذہب ہے اور ہیومنزم اور سیکولرزم کو اس لیے رد نہ کریں کہ وہ مذہب نہیں ہیں؟ یہ کیسی سادہ لوحی ہے؟ اصل بات کسی فکر پر 'مذہب' کے لفظ کے اطلاق کا نہیں بلکہ کسی فکر کا نظامِ حیات ہونا ہے۔

﴿مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ﴾ (آل عمران ۳: ۸۵)

یہاں دین بمعنی محض آسمانی مذہب نہیں بلکہ دین بمعنی نظریۂ حیات ہے [1]۔لہٰذا جو نظریۂ حیات بھی توحید، رسالت، آخرت، وحی اور ان کی بنیاد پر بننے والے نظام حیات کی نفی کرتا ہو وہ قابل رد ہے،خواہ وہ کسی آسمانی مذہب پر مبنی ہو یا انسانی فکر پر۔ لہٰذا ہیومنزم، سیکولرزم، لبرلزم وغیرہ جیسے الحادی نظریات پر مبنی مغربی نظریۂ حیات قابل رد ہے اور کسی لحاظ سے بھی مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں۔

جو علماء اور سکالرز مغربی تہذیب اور اس کے اصولوں کے مسلمانوں کے لیے قابل قبول ہونے کی بات کرتے ہیں وہ عموماً مغربی تہذیب سے، جو اس وقت دنیا کی غالب اور برتر تہذیب ہے، یا تو ناواقف ہوتے ہیں اور یا اس سے لاشعوری طور پر اتنے مرعوب ہوتے ہیں کہ اُن سے اسلامی اصولوں اور ان کے تقاضوں سے صرف نظر ہو جاتا ہے اور مغربی تہذہب کی خامیوں اور اس کے کمزور پہلوؤں پر ان کی نظر نہیں پڑتی مثلاً جاوید غامدی صاحب اہل مغرب اور مغربی تہذیب سے مسلمانوں کی قربت کے اس لیے مؤید ہیں کہ ان کی رائے میں وہ اہل کتاب اور ایک نبی کی امت ہیں اور

۱۔ نیز دیکھیے المائدہ ۵: ۳، التوبہ ۹: ۲۹، الشوریٰ ۴۲: ۱۳

قرآن نے ان سے الٰہ کے مشترک تصور پر مسلمانوں کے ڈائیلاگ کی حمایت کی ہے۔[1] اور وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اہل مغرب کا نظام زندگی اس وقت عیسائی عقائد پر مبنی نہیں بلکہ ہیومنزم اور سیکولرزم جیسے الحادی افکار پر مبنی ہے اور عیسائیت کے اثرات مغربی نظام زندگی میں برائے نام ہیں۔ اسی طرح ان اہل کتاب کے بارے میں قرآن حکیم نے جو کچھ کہا ہے اس سے بھی وہ صرف نظر کر لیتے ہیں اور مسلمانوں کے ساتھ ان کا نفرت، انتقام، تصادم اور دشمنی پر مبنی رویہ بھی ان کو یاد نہیں رہتا۔ اسی طرح نومسلم مغربی دانشور ڈاکٹر ہوفمین اسلامی اور مغربی تہذیب کی قربت کے اتنے شدید خواہشمند ہیں کہ ان کے نزدیک دونوں میں مغایرت ہے ہی نہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی تہذیب کوئی مستقل اور منفرد تہذیب نہیں بلکہ وہ ہر جگہ مقامی ثقافتوں کا رنگ لیے ہوئے ہے اور یہ کہ مغربی تہذیب بھی کوئی الگ اور منفرد تہذیب نہیں جو اسلامی اصولوں کی مخالف ہو بلکہ وہ تو رومی، ایرانی، اور اسلامی تہذیبوں ہی کا ایک تسلسل ہے۔[2] اور ڈاکٹر جاوید اقبال تو کھل کر کہتے ہیں کہ مغربی تہذیب، اسلامی تہذیب کی توسیع ہی کی ایک صورت ہے اور دین اسلام کا متوارث چلے آنے والا ڈھانچہ مرحوم عربی ثقافت پر مبنی ہے لہٰذا آج کے مسلم اسکالرز کو چاہیے کہ وہ موجودہ مغربی تہذیب کے تقاضوں کے مطابق قرآن وسنت کی نصوص کی تعبیر نو کر کے اس کو جدید بنالیں[3] گویا کہ وہ موجودہ اسلام کی کتر بیونت کر کے اسے مغربی تہذیب کے تقاضوں کے مطابق ڈھال لیں تاکہ دونوں میں مطابقت اور ہم آہنگی پیدا ہو جائے۔ ایسی ہی صورت حال کے لیے ان کے والدگرامی نے کہا تھا کہ ؎

خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

۱۔ افضال ریحان، اسلامی تہذیب بمقابلہ مغربی تہذیب، ص ۳۱، دار التذکیر لاہور، ۲۰۰۴ء

۲۔ سہ ماہی مغرب اور اسلام، شمارہ جولائی تا دسمبر ۲۰۰۰ ص ۲۵، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز، اسلام آباد

۳۔ افضال ریحان، ص ۱۷ ومابعد

ظاہر ہے کہ یہ موقف وہی لوگ اپنا سکتے ہیں جن کی چشم بصیرت بالا دست مغربی تہذیب کی چکا چوند سے خیرہ ہو چکی ہو اور جو آزاد ذہن کے ساتھ کچھ سوچنے پر قادر ہی نہ رہے ہوں کہ نہ ان کو اسلام کی انفرادیت نظر آتی ہے اور نہ وہ اس کے مستقل تہذیبی وجود کی بقا کا سوچتے ہیں اور وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے اسلام کے اس ایڈیشن کو جو حضرت محمد ﷺ پر اترا، اسلام کا آخری ایڈیشن قرار دیا ہے اور اس کے تسلسل، بقاء اور ہمیشہ مکمل رہنے کے لیے ایک پورا نظام کار وضع کیا ہے، (ختم نبوت کا اعلان کیا، قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود لیا، آنجناب ﷺ کو سارے عالم کے لیے قیامت تک کے لیے رسول قرار دیا، [اسی وجہ سے آنحضرت ﷺ کی سنت بھی محفوظ ہوئی] اور بجائے اس کے کہ وہ مسلمانوں کو یاد کراتے کہ وہ خود کو اسلام کے مطابق بدلیں اور اپنی دنیا و آخرت میں کامیابی کا سامان کریں، وہ انہیں یہ مشورہ دیتے ہیں کہ خود کو اور اپنے دین کو مغربی تہذیب کے تقاضوں کے مطابق بدل لو۔ اور ایسا مشورہ دیتے ہوئے وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ مغربی تہذیب کی اساس کسی الہامی دین پر نہیں، ہیومنزم، سیکولرزم اور لبرلزم جیسے الحادی افکار پر ہے اور اس تہذیب کے علمبرداروں نے پہلے بزورِ بازو مسلمانوں کو بڑی بے دردی سے کچلا اور ان کی سیاسی و تہذیبی قوت و شوکت کو توڑا اور انہیں غلام بنا لیا اور آج بھی ہماری آنکھوں دیکھتے وہ آہنی ہتھوڑا لیے مستعد بیٹھے ہیں اور جو مسلمان معاشرہ ذرا بھی سر اٹھاتا ہے وہ اس کا سر کچل کر رکھ دیتے ہیں۔ ان حالات میں مسلمانوں کو مغربی تہذیب کی پیروی کا درس دینا خود فریبی اور روباہی کے علاوہ کیا ہے؟ آج جب مسلمانوں کے بزدل حکمران اور غرض مند طبقے مغربی حکمرانوں کے ایجنٹ کا کردار ادا کر رہے ہیں، بعض مسلمان اہل دانش بھی اپنے فکری افلاس کی وجہ سے خود فریبی کا شکار ہو کر مسلمانوں کو مغربی تہذیب کو قبول کرنے، اس کی پیروی کرنے اور اسلام کو اس کے مطابق ڈھالنے کے نعرے بلند کر رہے ہیں، تفو بر تو اے چرخ گردوں تفو۔

خلاصہ یہ کہ جو مسلمان یہ کہتے ہیں کہ ہمیں مغربی تہذیب کو قبول کر لینا چاہیے ہمارے نزدیک ان کا رویہ غلط اور نامناسب ہے۔ وہ یا تو اسلامی فکر اور اس کے تقاضوں کو نہیں سمجھتے یا مغربی تہذیب کے الحادی اصولوں پر ان کی نظر نہیں یا وہ مغرب کی بالادست تہذیب سے لاشعوری طور پر اتنے مرعوب ہیں کہ انہیں مغربی تہذیب کی خامیاں اور اسلامی تہذیب کی منفرد خصوصیات نظر نہیں آتیں اور انہیں یہ احساس نہیں کہ مسلمانوں کے بے دین مغربی تہذیب کو قبول کرنے کا لازمی نتیجہ اس تہذیب کی اندھی پیروی ہوگا جس سے ان کی اسلامیت آہستہ آہستہ دھندلاتی ہوئی ختم ہو جائے گی، اعاذنا اللہ منہ۔

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپایدار ہوگا

سفینۂ برگِ گل بنا لے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش، مگر یہ دریا سے پار ہوگا

سنا دیا گوشِ منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا، پھر استوار ہوگا

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہوگا

(اقبال)

مغربی تہذیب سے مفاہمت کر لی جائے

اس رویے کے مؤیدین کے دلائل

۱۔ اگر اہل مغرب سے ہمارے کچھ اختلافات ہیں تو ان سے گفتگو اور ڈائیلاگ کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے تا کہ دونوں تہذیبوں میں مفاہمت پروان چڑھے اور پرامن طریقے سے اختلافات حل ہو سکیں۔

۲۔ مسلمان بنیادی طور پر داعی ہیں اور اللہ و رسول نے ہمیں ساری قوموں تک دین پہنچانے کا حکم دیا ہے۔ اس لحاظ سے اہل مغرب اپنی گمراہیوں اور خرابیوں کے باوجود ہمارے لیے امت دعوت کی حیثیت رکھتے ہیں اور ظاہر ہے دعوت پہنچانے کا یہ اہم ترین فریضہ امن وسکون اور مفاہمت کے ماحول میں ہی انجام پا سکتا ہے۔

۳۔ اگر اہل مغرب ہم سے نفرت اور دشمنی کا رویہ بھی رکھتے ہیں تو اسلام نے ہمیں اخلاق کریمانہ کا درس دیا ہے لہٰذا ہم اپنے محبت اور اخوت کے جذبے سے ان کی دشمنی کو دوستی میں بدل سکتے ہیں جیسا کہ ماضی میں ہماری روایت میں صوفیاء کرام کا طریقہ رہا ہے۔

۴۔ اسلام امن و آشتی کا علمبردار دین ہے لہٰذا آج کل جن مسلمانوں نے مغرب کے بے گناہ شہریوں کے قتل و غارت کا طریقہ اختیار کیا ہوا ہے وہ غلط ہے کیونکہ اس سے اسلام کی بدنامی اور مسلمانوں کی ہوا خیزی ہو رہی ہے اور انہیں مشکلات و مصائب کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

ہمارا نقطۂ نظر

مغرب کے ساتھ مفاہمت کے حق میں یا اس کے خلاف رائے نہیں دی جا سکتی جب تک پہلے یہ نہ طے کر لیا جائے کہ مفاہمت سے مراد کیا ہے؟ دیکھیے! مفاہمت کے دو تصور ہیں، ایک صحیح اور دوسرا غلط۔ مفاہمت کا جو صحیح تصور ہے، ہم اس کے قائل ہیں اور اس کا جو غلط تصور ہے ہم اس کے خلاف ہیں۔ تو آیئے پہلے یہ دیکھیں کہ مغرب سے مفاہمت کا صحیح تصور کیا ہے اور غلط تصور کون سا ہے؟ اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی ذہن میں رکھنا ہوگا کہ مفاہمت دراصل دو فریقوں میں باہمی افہام و تفہیم کا نام ہے لہٰذا صرف ایک فریق کے چاہنے سے مفاہمت نہیں ہو سکتی لہٰذا ہمیں دوسرے فریق کے رویے کا جائزہ بھی لینا ہوگا کہ آیا وہ بھی مفاہمت چاہتا ہے یا نہیں؟

مفاہمت کا صحیح تصور

ہمارے نزدیک مفاہمت کا صحیح تصور یہ ہے کہ اگر فریقین میں اختلافات ہوں تو انہیں چاہیے کہ وہ باہم گفتگو اور ڈائیلاگ کا طریقہ اختیار کریں تاکہ:

- وہ ایک دوسرے کا نقطۂ نظر براہ راست سن کر اسے اچھی طرح سمجھ سکیں۔
- ان کے درمیان غلط فہمیاں ختم یا کم ہو جائیں
- ان کے درمیان اختلافات ختم ہو جائیں یا کم از کم ان کی شدت کم ہو جائے۔
- وہ باہم امن و سکون سے رہ سکیں۔
- ان کے اختلافات مخالفت اور دشمنی کا رنگ نہ اختیار کر لیں۔

تاہم مفاہمت سے یہ نتائج حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ مندرجہ ذیل خصوصیات کی حامل ہو:

۱۔ اس میں فریقین کی حیثیت مساوی ہو اور فریقین اپنی آزاد مرضی سے مفاہمت کریں۔

۲۔ کوئی فریق اپنے اصول نہ چھوڑے اور دوسرے فریق کے اصول نہ اپنائے۔

دوسرے لفظوں میں کسی ایک فریق کو اپنے اصول اور اپنی رائے دوسرے فریق پر زبردستی مسلط کرنے کا حق نہ ہو۔

۳۔ کوئی فریق دب کر مفاہمت نہ کرے یعنی کوئی ایک فریق اپنی قوت و طاقت سے دوسرے کو مفاہمت پر مجبور نہ کرے۔

۴۔ جن اصولوں پر مفاہمت کی جائے وہ عدل و انصاف کے معروف اور مسلمہ اصولوں کے مطابق ہوں۔

اگر مفاہمت مندرجہ بالا اصولوں پر مبنی ہوگی تو صحیح اور تعمیری ہوگی بلکہ موثر اور پائیدار ہوگی۔

ہمارے نزدیک اسلام ایسے ڈائیلاگ اور ایسی مفاہمت کے حق میں ہے کیونکہ وہ محبت، اخوت، رواداری، شائستگی، اچھی ہمسائیگی اور امن عالم کا علم بردار ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے بعثت سے قبل مکہ میں ایک ایسے ہی معاہدۂ امن (حلف الفضول) میں شرکت کی تھی اور بعثت کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں آج بھی ایسے کسی معاہدے میں شرکت کرنا پسند کروں گا خواہ اس کے خلاف مجھے کتنی ہی ترغیب اور لالچ دیا جائے۔[1] چنانچہ مسلمانوں نے کبھی ایسے ڈائیلاگ اور ایسی مفاہمت سے انکار نہیں کیا۔ نبی کریم ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو آپؐ نے یہود اور مقامی قبائل سے مل کر ایک 'امن چارٹر' تیار کیا جسے قدیم ترین سوشل کنٹریکٹ یا آئینی معاہدہ کہا جاسکتا ہے۔[2] اسی طرح صلح حدیبیہ میں بھی آپؐ نے ایک ایسے معاہدۂ امن پر دستخط کیے جسے دیکھ کر بظاہر یوں لگتا تھا کہ گویا مسلمانوں نے دباؤ میں آکر اور اپنی پوزیشن کی کمزوری تسلیم کرکے معاہدہ امن کیا ہے۔[3] دعوت و جہاد میں بھی آپؐ کا اسوۂ مبارکہ یہی تھا

۱۔ مسند احمد بن حنبل، ج:۱،ص ۱۹۰

۲۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ، عہد نبوی میں نظام حکمرانی، اردو اکیڈیمی، کراچی ۱۹۸۷ء

۳۔ صحیح بخاری، کتاب الجزیہ، باب اثم من عاہد ثم غدر

کہ اگر فریق مخالف اسلام کی دعوت قبول کر لے یا کم از کم اسلام کی برتری تسلیم کر لے تو اس کے ساتھ مفاہمت کا راستہ اپنایا جائے گا۔ (۱) نبی کریم ﷺ کے اس اسوہ کا یہ اثر تھا کہ خوارج سے شدید ترین اختلاف کے باوجود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے خلاف ایکشن لینے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ جب تک وہ ہم پر ہاتھ نہیں اٹھائیں گے ہم ان کے خلاف ایکشن نہیں لیں گے۔ (۲)

علاوہ ازیں اسلام حریت فکر کا قائل ہے اور ہر قسم کے جبر کی مذمت کرتا ہے۔ اس کا بنیادی اصول ہے کہ "لَاۤ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ" (۳) یعنی دین قبول کرنے میں کوئی جبر نہیں جو چاہے حق کو قبول کر لے، جو چاہے نہ کرے (اگرچہ ان کے نزدیک حق ہی اس کا مستحق ہے کہ اسے قبول کیا جائے) اور دعوت وتبلیغ اور اختلاف میں اسلام کا بنیادی اصول ہے "وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ" یعنی ڈائیلاگ اور وہ بھی شائستگی اور متانت کے ساتھ اور یہ کہ مشترکہ اور متفقہ امور کو، خواہ وہ کمزور ہی ہوں، ڈائیلاگ کی بنیاد بنایا جائے تاکہ بات آگے بڑھ سکے جیسے اہل کتاب سے کہا گیا کہ ہمارے تمہارے درمیان کم از کم ایک مشترک بنیاد 'تصور الٰہ' کی موجود ہے۔ آیئے اسی کو بنیاد بنا کر بات شروع کرتے ہیں۔ (۴)

تو اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کی نظریاتی پوزیشن یہ ہے کہ انہیں گفتگو اور ڈائیلاگ کرنا چاہیے تاکہ اختلافات کم ہوں اور مفاہمت فروغ پائے۔ اس ڈائیلاگ اور مفاہمت کی ضرورت ہر صورت میں ہے خواہ مسلمانوں کے اندرونی مسائل ہوں یا ان کے غیر مسلموں کے ساتھ تنازعات ہوں۔

۱۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، باب فی دعا المشرکین

۲۔ مسند احمد بن حنبل، ج ۱، ص ۹۱۔ ۹۶، ۱۳۹۔ ۱۴۰

۳۔ البقرہ ۲: ۲۵۶

۴۔ آل عمران ۳: ۶۴

اسلام مفاہمت کا حامی ہے

مفاہمت کے بارے میں ہم نے سطور بالا میں جو نقطۂ نظر اختیار کیا ہے ممکن ہے بعض اصحاب کو اس پر اعتراض ہو اور وہ کہیں کہ اگر مسلمان مفاہمت کے اتنے ہی قائل ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں نے کفار سے لڑائیاں لڑیں، خود خلافت راشدہ میں اصحاب رسول آپس میں لڑتے رہے اور مسلمانوں نے ہمسایہ رومی اور ایرانی حکومتوں پر حملے کیے؟ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ اعتراضات حقائق کو ان کے صحیح پس منظر میں نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ جہاں تک عہد نبوی میں کفار کے ساتھ لڑائیوں کا تعلق ہے تو حملے ہمیشہ کفار نے کیے۔ وہ مسلمانوں کا وجود مٹانا چاہتے تھے اور مسلمانوں نے صرف اپنا دفاع کیا اور اپنی جان بچانے کی کوشش کی جس کی اجازت دنیا کا ہر قانون دیتا ہے اور جو دنیا میں عدل وانصاف کے معروف اور مسلمہ اصولوں کے عین مطابق ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرتِ معاویہ رضی اللہ عنہ کی لڑائیوں کا معاملہ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ آئینی اور قانونی طور پر منتخب شدہ مرکزی حکومت کے سربراہ تھے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے شام کے صوبے کا گورنر ہونے کی حیثیت سے ان کی اطاعت قبول نہ کرکے گویا ان کے خلاف بغاوت کی۔ اس کے باوجود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھرپور ڈائیلاگ کیے اور مفاہمت کی پوری کوشش کی، جب یہ کوششیں ناکام ہوگئیں تو مرکزی حکومت کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے ریاست کے وجود کو قائم رکھنا، قانون کی عملداری اور امن وامان کی بحالی ان کی ذمہ داری تھی جسے انہوں نے پورا کیا۔ جہاں تک رومیوں اور ایرانیوں کے ساتھ جنگوں کا تعلق ہے تو اس کا تعلق توسیع دعوت کی حکمت عملی سے ہے اور اس کا پس منظر یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کی رو سے جو شخص مسلمان ہو اگر وہ اس کی استطاعت رکھتا ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ محبت، اخوت اور مساوات کی جس دعوت کو اس نے قبول کیا ہے وہ اسے دوسروں تک بھی پہنچائے تاکہ دوسرے لوگوں کا بھی دنیا و آخرت کا بھلا ہو۔ پھر اس طریقے سے پرامن دعوتی

جدو جہد کرتے ہوئے، بغیر کسی جبر و اکراہ کے، مسلمان اگر بہت زیادہ تعداد میں ہوں اور اس کی استعداد بھی رکھتے ہوں تو انہیں چاہیئے کہ ایک مسلم معاشرہ اور ایک مسلم ریاست قائم کریں۔ پھر جب وہ ایسا کرلیں تو اگر وہ استعداد رکھتے ہوں تو انہیں چاہیے کہ اسلام کا محبت و اخوت کا یہ عالمگیر پیغام دوسرے معاشروں تک بھی پہنچائیں اور یہ کام مکمل طور پر پرامن دعوتی ذرائع اور اپنے اچھے اخلاق اور شائستہ گفتگوؤں کے ذریعے کریں۔ اور اگر اس کام کے راستے میں وہاں کی حکومت حائل ہو تو اس سے بھی ڈائیلاگ کریں اور اسے پرامن ذرائع سے قائل کرنے کی کوشش کریں اور اگر اس میں بھی ناکامی ہو اور وہ اس کی استطاعت رکھتے ہوں تو پھر آخری چارۂ کار کے طور پر اسلام انہیں اس امر کی اجازت دیتا ہے کہ جو حکومت ان کے اس امن مشن میں حائل ہو اس کی مزاحمت ختم کردیں تاکہ وہاں کے لوگوں کو اس حکومتی جبر سے نجات ملے۔ انسان، انسان کی غلامی سے آزاد ہو اور اللہ رب العالمین کی پناہ میں آجائے اور اس طرح لوگوں کی دنیا و آخرت میں بہتری کا پیغام ان تک پہنچانے میں حائل رکاوٹ کو دور کردیا جائے۔

تاہم یہ بات پھر بھی ذہن میں رہے کہ اس سب کے باوجود لوگوں کے اسلام قبول کرنے کے معاملے میں مسلمان پھر بھی جبر نہیں کرسکتے اور نہ اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ سے اس کی ایک بھی مثال پیش کی جاسکتی ہے کہ کسی مسلمان حکومت نے بالجبر اسلام کو کسی معاشرے پر مسلط کیا ہو۔ گویا سوائے اس آخری ناگزیر صورت کے، اور وہ بھی بشرط استطاعت، اسلام میں کہیں بھی طاقت کے استعمال کی اجازت نہیں ہے اور اندرون و بیرون ملک اسلامی حکومت کی ساری پالیسیاں گفتگو اور ڈائیلاگ اور امن اور بھائی چارے پر مشتمل ہوتی ہیں اور ہونی چاہئیں۔

موجودہ حالات میں مفاہمت کی حکمت عملی کی ضرورت

سطور بالا میں ہم نے جو کچھ عرض کیا اس سے پتہ چلتا ہے کہ نظری لحاظ سے اسلامی تعلیمات کا اصول اور عمومی تقاضا یہ ہے (سوائے مذکورہ استثنٰی کے) کہ مسلمانوں کی

ساری پالیسیاں ڈائیلاگ، گفتگو، دلائل اور مفاہمت پر مبنی ہونی چاہئیں، اب ہم اس سے آگے بڑھ کر یہ بات کہنا چاہتے ہیں کہ اس وقت مسلمانوں کو عملاً جو حالات درپیش ہیں، ان کا تقاضا یہی ہے کہ وہ ڈائیلاگ اور مفاہمت کی پالیسی اختیار کریں۔ یہ عملی حالات اور ان کے تقاضے کیا ہیں؟ آیئے دیکھتے ہیں:

مسلمان اس وقت کمزور ہیں: ایمانی اور اخلاقی لحاظ سے، سیاسی اور مالی لحاظ سے، تعلیمی اور دفاعی لحاظ سے، غرض ہر لحاظ سے وہ دنیا کی دسری قوموں رتہذیبوں خصوصاً مغرب سے پیچھے ہیں۔ مزید یہ کہ وہ منتشر ہیں، چھوٹی چھوٹی بہت سی ریاستوں میں منقسم ہیں اور ان میں اتحاد نہیں۔

اپنی مذکورہ بالا کمزوریاں دور کرنے کے لیے مسلمانوں کو وقت درکار ہے۔ ان کی پہلی ضرورت یہ ہے کہ ان کے اندر احساس زیاں جاگے اور یہ جگایا جائے۔ اس کے بعد بنیادی ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیم وتربیت کے ذریعے مسلم شخصیت کی اسلامی بنیادوں پر تعمیرنو کا نظام قائم کیا جائے تاکہ مسلمانوں کی ایمانی اور اخلاقی کمزوری دور ہو۔ جب یہ ہوگا تو گویا ان کی قوت کا منبع متحرک ہو جائے گا، ڈائینمو چالو ہو جائے گا۔ پھر وہ علم وتحقیق میں ترقی کریں گے، سائنس وٹیکنالوجی میں ترقی کریں گے، ان میں اتحاد پیدا ہوگا، سیاسی اور مالی استحکام آئے گا اور وہ طاقت ور ہوتے چلے جائیں گے۔ لیکن یہ کام، جب کوئی کرنے کا ارادہ بھی کرلے، تو ظاہر ہے یہ دو چار سال میں ہونے والا کام نہیں۔ یہ کئی دہائیوں کا کام ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کی توانائیاں فضول ادھر ادھر کی چپقلشوں میں ضائع نہ ہوں تاکہ وہ تعلیم وتربیت کے بنیادی میدان میں اور اس کے بعد زندگی کے دوسرے شعبوں میں (معیشت میں، سیاست میں، ٹیکنالوجی میں ......) تیز رفتار اور مسلسل ترقی کرسکیں، ان کی ترقی وتعمیر کے کاموں میں رکاوٹ نہ پڑے تاکہ بتدریج وہ جہالت، افلاس، انتشار اور ضعف کے موجودہ گرداب سے نکلیں اور پہلے خود انحصاری اور پھر قوت وشوکت کی منزل کی طرف بڑھیں۔

موجودہ حالات میں مسلمانوں کو مغرب سے مفاہمت اور ڈائیلاگ کی ضرورت

اس لیے بھی ہے کہ وہ مغربی عوام کو اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں صحیح صورت حال سے آگاہ کر سکیں۔ وہاں اس وقت کیفیت یہ ہے کہ مسلمانوں کے خلاف شدید رویہ رکھنے والی سیاسی (اور دینی) قیادت نے جھوٹے پراپیگنڈے کے زور پر عوام کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکا رکھا ہے اور عوام اصل صورت حال سے بے خبر ہیں۔ مغربی اور بالخصوص امریکی عوام اس بات سے بھی بے خبر ہیں کہ یہ سب صیہونیوں کی سازش سے ہو رہا ہے جنہوں نے امریکی ذرائع ابلاغ اور مالیات پر قبضہ کر رکھا ہے اور سیاسی لحاظ سے امریکی سیاسی قیادت کو قابو کیا ہوا ہے اور اس طرح وہ مغرب اور امریکہ کے عیسائیوں کو کامیابی سے مسلم دنیا سے لڑا رہے ہیں۔ لہٰذا اس امر کی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ مسلمان منصوبہ بندی سے اور ابلاغ کے جدید ترین ذرائع موثر طریقے سے استعمال کرتے ہوئے مغربی (خصوصاً امریکی) عوام تک پہنچیں اور انہیں بتائیں کہ مسلمان نہ تو دہشت گرد ہیں اور نہ تنگ نظر۔ وہ نہ آمریت کے حامی ہیں اور نہ حریت فکر، عدل، علم، جمہوریت اور رواداری کے دشمن بلکہ اسلام تو امن، راستی اور سلامتی کا علمبردار ہے۔ مسلمان اگر یہ کام کر لیتے ہیں تو وہ مغرب و امریکہ کے متشدد حکمرانوں کے ظلم و ستم سے بھی بچ سکیں گے اور دین کی اسلام دعوت وہاں پہنچانے کا فریضہ بھی ادا کر سکیں گے۔

مفاہمت کی یہ حکمت عملی منصوص ہے

ہم کہتے ہیں مفاہمت کی یہ حکمت عملی منصوص ہے کوئی ہماری ذاتی یا انفرادی رائے نہیں۔ اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ قرآن حکیم اور اسوۂ رسول کریم ﷺ سے بھی ہمیں یہی رہنمائی ملتی ہے کہ اس طرح کے کمزوری کے حالات میں ڈائیلاگ پر مبنی مفاہمتی اور پرامن حکمت عملی ہی اختیار کرنی چاہیے۔ دیکھیے نبی کریم ﷺ نے مکہ میں جہاد نہیں کیا اقدامی تو رہا ایک طرف دفاعی جہاد بھی نہیں کیا، کیوں؟ اس کا جواب عموماً یہ دے دیا جاتا ہے کہ اللہ کی طرف سے حکم نہیں تھا۔ سوال یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے حکم کیوں نہیں تھا؟ مطلب یہ کہ شارع کے اس حکم کے پیچھے کیا حکمت اور علت پوشیدہ تھی؟ تو وہ حکمت

(اگرچہ دوسری حکمتیں بھی تھیں مثلاً یہ کہ تعلیم وتربیت کی کٹھالی سے گزار کر ایسے افراد تیار کیے جائیں جو مطلوبہ اسلامی انقلاب لانے کی صلاحیت رکھتے ہوں)۔ پھر جب کچھ استطاعت بڑھی تو مدینہ میں جا کر دفاعی جہاد کی اجازت ملی اور جب اسلامی معاشرہ اور مدینہ کی ریاست قدرے مستحکم ہوگئی تو پھر دعوت کو دوسرے معاشروں تک لے جانے کی اجازت ملی۔ تو گویا استطاعت رکھنا اور دیکھنا ایک شرعی اساس رکھتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مسلمانوں اور کفار میں اگر ایک اور دو کی نسبت ہو تو پھر ہی مسلمانوں کو فتح کی امید کرنی چاہیے[1]۔ اگرچہ ساتھ یہ بھی بتادیا کہ فتح ونصرت صرف اللہ کے اختیار میں ہے[2] اور وہ چاہے تو کسی چھوٹے اور کمزور گروہ کو بڑے اور مضبوط گروہ پر بھی غلبہ عطا کرسکتا ہے[3]۔

تو خلاصہ یہ کہ موجودہ حالات میں عقل وحکمت کا تقاضا بھی یہی ہے اور شرعی احکام کا مفاد بھی یہی ہے کہ مسلمانوں کو اس وقت مفاہمت کی پالیسی پر ہی عمل کرنا چاہیے۔

سطور بالا میں جو کچھ ہم نے عرض کیا وہ مفاہمت کے صحیح تصور کے بارے میں تھا جس کی شرائط کا ذکر ہم اوپر کرچکے ہیں۔ آیئے اب دیکھیں کہ مفاہمت کا غلط تصور کیا ہے اور اس بارے میں مسلمانوں کا موقف کیا ہونا چاہیے؟

مفاہمت کا غلط اور قابل رد تصور

مفاہمت کے صحیح تصور کے اجزاء اور شرائط ہم نے سطور بالا میں بیان کردی ہیں۔ اگر کسی مفاہمت میں ان کا فقدان ہو تو وہ مفاہمت کا غلط تصور ہوگا۔ گویا کہ مندرجہ ذیل صورتوں میں مفاہمت غلط ہوگی:

۱۔ الانفال ۸:۶۶

۲۔ آل عمران ۳:۱۲۶

۳۔ البقرۃ ۲:۲۴۹

۱۔ جب فریقین کی حیثیت برابر نہ ہو اور ان میں سے کوئی اپنی آزاد مرضی سے مفاہمت نہ کر رہا ہو۔

۲۔ جب کسی ایک فریق کے لیے ایسے حالات پیدا کر دیے جائیں کہ اسے اپنے اصول چھوڑنے پڑیں اور دوسرے فریق کے اصول قبول کرنے پڑیں۔

۳۔ جب کسی ایک فریق کو دب کر مفاہمت کرنی پڑے اور مجبوراً صلح کی شرائط قبول کرنی پڑیں۔

۴۔ جن اصولوں پر مفاہمت کی جائے وہ عدل و انصاف کے معروف اور مسلمہ اصولوں کے مطابق نہ ہوں۔

تو اب بات واضح ہوگئی کہ اسلام مفاہمت کے صحیح تصور کا قائل ہے اور اس کے غلط تصور کو رد کرتا ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کے لیے صحیح طرز عمل یہی ہے کہ وہ صحیح مفاہمت کو قبول کریں اور غلط مفاہمت کو رد کر دیں۔ اور الحمد للہ کہ جمہور مسلمانوں کا، اپنی بہت سی کمزوریوں کے باوجود، آج کل یہی موقف ہے کہ وہ صحیح مفاہمت کے قائل ہیں اور اس پر عمل پیرا ہونا چاہتے ہیں۔ وہ کسی قوم یا ملک سے سرد یا گرم جنگ کے متمنی ہیں اور نہ ظلم و جبر سے کسی پر اپنا نقطۂ نظر ٹھونسنا چاہتے ہیں بلکہ وہ امن و آشتی سے رہنا چاہتے ہیں، گفتگو اور ڈائیلاگ میں یقین رکھتے ہیں اور امن و سلامتی کے علمبردار ہیں۔

کیا مسلمانوں اور مغربی تہذیب / اقوام میں مفاہمت ممکن ہے؟

جیسا کہ ہم نے ابتدا میں کہا تھا کہ مفاہمت دو فریقوں میں ہوتی ہے اور محض کسی ایک فریق کے چاہنے سے مفاہمت نہیں ہوسکتی۔ اس وقت زیر بحث بات یہ ہے کہ کیا مسلمانوں اور مغربی تہذیب کے حامل ممالک میں مفاہمت ہوسکتی ہے یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے اس مفاہمت میں کوئی امر مانع نہیں۔ مسلمان اس مفاہمت کے لیے تیار ہیں۔ مسلمانوں کو اس بات کا احساس ہے کہ وہ چونکہ کمزور ہیں اس لیے وہ کشمکش اور جنگ افورڈ ہی نہیں کر سکتے۔ انہیں تو امن و امان درکار ہے

تاکہ وہ مسلسل ترقی کر کے قوموں کی دوڑ میں آگے بڑھ سکیں لہٰذا وہ تو مفاہمت کے خواہش مند ہیں اور اس کے شدید متمنی ہیں۔ مفاہمت میں حقیقی رکاوٹ مسلمان نہیں بلکہ مغربی تہذیب کے حامل ممالک ہیں۔ ان کی مثال بھیڑیے اور میمنے کی سی ہے جو مشرق کی ایک معروف اور دلچسپ لوک روایت ہے کہ ایک ندی میں میمنا پانی پی رہا تھا کہ اوپر سے بھیڑیا آ گیا۔ میمنے کو دیکھ کر اس کی نیت میں فتور آ گیا۔ اس نے پانی کی طرف منہ بڑھاتے ہوئے کہا 'اے تم پانی گدلا کیوں کر رہے ہو؟' میمنے نے ہکلا کر جواب دیا 'جناب میں پانی کس طرح گدلا کر سکتا ہوں پانی تو آپ کی طرف سے میری سمت آ رہا ہے۔' بھیڑیے نے بگڑ کر جواب دیا 'ٹرٹر مت کر! پچھلے سال بھی جب میں پانی پینے آیا تھا تو تم نے پانی گدلا کر دیا تھا؟' میمنے نے لجاجت سے جواب دیا 'جناب! پچھلے سال تو میں پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔' بھیڑیے کو بڑا غصہ آیا اس نے کہا: 'تم نہیں، تو پھر وہ تمہارا باپ ہوگا۔' یہ کہہ کر اس نے میمنے پر چھلانگ لگائی، اس کا گلا ادھیڑا اور آرام سے بیٹھ کر اس کا نرم گوشت کھانے لگا۔

تو اس وقت مسئلہ بیچارے مسلمانوں کا نہیں کہ وہ مغرب سے مفاہمت نہیں کرنا چاہتے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ مغرب مفاہمت نہیں کرنا چاہتا بلکہ مفاہمت کا کیا سوال اصل بات یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو برداشت نہیں کر پا رہا کہ وہ زندہ کیوں ہیں اور اس کی کوششوں کے علی الرغم آہستہ آہستہ ترقی کیوں کر رہے ہیں؟ مغرب نہیں چاہتا کہ مسلمان اپنے پیروں پر کھڑے ہوں اور وہ سر اٹھا کے جیئیں۔ پہلے اس نے مسلمانوں کے علاقے فتح کیے، انہیں غلام بنایا، انہیں لوٹا کھسوٹا، ان کی دولت سے اپنا گھر بھرا، اس پیسے سے ایجادات کیں، انڈسٹری چلائی اور اپنی چیزیں مہنگے داموں بیچ کر پھر انہی مسلمانوں سے مزید پیسے بٹورے۔ پھر آپس کی خانہ جنگی سے (پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے نتیجے میں) جب مغرب کمزور ہوا اور مسلمان ممالک نے غلامی کے خلاف مزاحمت جاری رکھی تو اسے ناچار انہیں آزادی دینا پڑی لیکن اب بھی وہ انہیں مرغ

دست آموز بنائے رکھنے پر مصر ہے اور اس کی کوششوں کے نتیجے میں مسلمان ممالک کے اکثر حکمران اور حکمران طبقات اس کی مٹھی میں ہیں۔ ہوا یہ ہے کہ مغربی ممالک خصوصاً امریکہ کے مظالم کی وجہ سے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی اکثریت ان سے نفرت کرتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ کچھ نہیں کرسکتی اور اپنی بقا کی خواہش اور ترقی کی امید میں کچھ کرنا بھی نہیں چاہتی لیکن چند سرپھرے مسلمانوں نے، جو مسلم ممالک کی آبادی کا شاید ایک فیصد بھی نہیں، مغرب کے ظلم وجبر اور ناانصافی کے خلاف بغاوت کردی ہے اور اس کے لیے تن من کی قربانی دینے کے لیے تیار ہوگئے ہیں۔ چونکہ وہ جم کر لڑنے کی سکت نہیں رکھتے لہٰذا انہوں نے گوریلا جنگ شروع کردی ہے۔ ان کا مقصد اپنے ظالم اور جابر دشمن کو زیادہ سے زیادہ زک پہنچانا ہے۔ بھیڑیے کو شدید غصہ آرہا ہے کہ میمنا اس کے قابو میں نہیں آرہا۔

اندریں صورت مغرب نے شدید پروپیگنڈا شروع کردیا ہے کہ مسلمان دہشت گرد ہیں، وہ بنیاد پرست ہیں، وہ جہادیے ہیں، وہ خونخوار ہیں، وہ مفاہمت نہیں کرنا چاہتے۔ ارے جناب! کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ! یہ بیچارے مسلمان کس باغ کی مولی ہیں اور انہوں نے کیا کرنا ہے! آپ نے افغانستان کا تورابورا کردیا۔ پونے دو ارب مسلمانوں اور مسلمانوں کے ۵۷ ممالک میں سے کتنوں نے احتجاج کیا؟ کتنے آپ کے منہ آئے؟ جناب کوئی بھی نہیں! اب آپ عراق کا تورابورا بنا رہے ہیں۔ آپ نے ہزاروں لوگ قتل کردیے، ان کے تیل کے کنوؤں پر قبضہ کرلیا، کتنے اسلامی ممالک آپ کے آڑے آئے؟ جناب کوئی بھی نہیں! تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان ممالک تو اپنے دفاع پر بھی قادر نہیں، اس دفاع کی جس کی اجازت دنیا کا ہر قانون دیتا ہے۔ بس چند سرپھرے ہیں جن سے افغانستان اور عراق میں آپ کا ظلم وستم برداشت نہیں ہورہا اور وہ آپ سے لڑ رہے ہیں، بلکہ لڑنا کیا ہے، اپنی جان و مال کی قربانیاں دے رہے ہیں۔ رہے عام مسلمان تو وہ بیچارے ''ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم'' کی مثال

بنے ہوئے ہیں اور وقت گزار رہے ہیں کہ کب آپ کا غصہ ٹھنڈا ہو اور وہ آرام سے زندگی بسر کریں۔ یہ ہے حقیقت اس سارے افسانے کی کہ مسلمان مفاہمت نہیں چاہتے۔

اہل مغرب امت دعوت ہیں مگر......

مندرجہ بالا گفتگو میں ان اکثر سوالات کا جواب آ گیا ہے جو مفاہمت کے غلط تصور کے مؤیدین اٹھاتے ہیں، تاہم ایک دو باتوں کا الگ سے ذکر ہو جائے تو بہتر ہے۔ ان میں سے ایک مسئلہ ان کے نزدیک یہ ہے کہ امت مسلمہ آخری نبی حضرت محمد ﷺ کی امت ہونے کے ناطے اس چیز کی مکلّف ہے کہ وہ ساری دنیا تک اسلام کی دعوت پہنچائے لیکن مسلمانوں میں سے چند سر پھرے لوگوں نے مغرب کے خلاف ''دہشت گردی'' کا جو بازار گرم کر رکھا ہے اس نے اہل مغرب کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مشتعل کر دیا ہے اور ایسے حالات باقی ہی نہیں رہنے دیے کہ امت مسلمہ ان تک دین کی دعوت پہنچائے۔ اس سے یہ بزرجمہر دو نتیجے اخذ کرتے ہیں: ایک تو یہ کہ سارا قصور صرف ان چند مسلمانوں کا ہے جو خود کو حریت پسند اور جہادیے کہلاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ عام مسلمانوں کا رویہ بھی اہل مغرب کے ساتھ غصے اور نفرت کا ہے جو داعی کے اخلاق کریمانہ کے منافی ہے۔ اس موقف کے جواب میں ہم عرض کریں گے کہ:

۱۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمان کو داعی ہونا چاہیے اور یہ کہ مسلمانوں نے پچھلی کئی صدیوں سے اس فریضے کو ہر سطح پر کما حقہ ادا کرنا چھوڑ دیا ہے خصوصاً غیر مسلموں تک دین کی دعوت پہنچانے میں تساہل سے کام لیا ہے۔ تاہم یہ ذہن میں رہے کہ اس کام کا جو بنیادی تقاضا ہے وہ یہ ہے کہ ہم دوسروں تک دین پہنچانے سے پہلے اس پر خود عمل کر کے دکھائیں، خصوصاً اجتماعی سطح پر کیونکہ لوگ گفتگو سے زیادہ عمل کو دیکھتے ہیں۔ شرعی حکم بھی یہی ہے کہ جو کہتے ہو خود اس پر عمل کرو[1]۔ اور جو آدمی کہے اور اس پر عمل نہ

۱۔ الصف ۶۱:۲

کرے تو یہ بالکل فطری اور نفسیاتی امر ہے کہ اس کی بات میں اثر نہیں ہوتا اور مدعو اس سے متاثر نہیں ہوتا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب روم اور ایران کے پاس اسلام کی دعوت لے کر گئے تھے تو اس لیے کامیاب ہوئے کہ ان کا ہر آدمی مجسم اسلام تھا اور مدینے کا معاشرہ ہزاروں میل دور سے اسلامی فکر و عمل کے ایک ماڈل کے طور پر روشن مینار کی طرح نظر آتا تھا۔ آج نہ کسی داعی میں اسلام مجسم نظر آتا ہے اور نہ کہیں اسلامی معاشرے کا ماڈل دکھائی دیتا ہے۔ ان حالات میں اگر ہم داعی بن کر اپنا دعوتی فریضہ انجام دینے کی کوشش سرگرمی سے کریں بھی تو کما حقہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس لیے دعوت کے نقطۂ نظر سے، اور ویسے بھی، ہماری پہلی ضرورت یہ ہے کہ ہم انفرادی اور اجتماعی سطح پر اسلامی فکر و عمل کا نمونہ بن کر دکھائیں۔

۲۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ مومن خصوصاً داعی کے اخلاق کریمانہ ہونے چاہئیں اور عفو و درگزر، رواداری، انکساری اور گالیوں کے جواب میں دعائیں دینا ایک داعی کی صفت ہونی چاہیے لیکن کیا غیرت، حمیت، خود داری، مردانگی اور شجاعت و بسالت اسلامی اخلاق نہیں ہیں؟ جب مدعو طاقت ور، متکبر، مغرور اور طاقت کے نشے میں مخمور ہو اور آپ کا حریف بھی ہو اور آپ پر ظلم و ستم بھی ڈھا رہا ہو تو اس کے سامنے بچھنا اور انکساری اختیار کرنا چہ معنی دارد؟ بہت سے لوگ مسلم صوفیاء کی مثالیں دیتے ہیں اور خصوصاً ہندوستان کے صوفیاء کی، لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ زمانہ اسلام کی سطوت و شوکت کا زمانہ تھا۔ مسلمان حکمران اخلاقی و روحانی لحاظ سے کچھ کمزور سہی لیکن سیاست، معیشت اور اسلحی قوت میں وہی غالب و بالا دست تھے اور اپنی قوت و حشمت کی وجہ سے وہ حاکم و مقتدر تھے اور غیر مسلم مغلوب و زیردست تھے۔ ان حالات میں مسلم حکمرانوں کی قوت و شوکت کو پشت پر رکھتے ہوئے صوفیاء کا انکسار اور رواداری ایک داعیانہ خوبی تھی اور اس کے نتائج بھی مفید نکلتے تھے۔ لیکن آج جب کہ مسلم حکمران خود مغرب کے زیردست، محتاج اور ان کے طفیلی بنے ہوئے ہیں اور اہل مغرب غالب و

بالا دست ہیں تو مسلم داعیوں کا انکسار اور حلم دعوتی نقطۂ نظر سے غیر مفید بھی ہے اور غیر فطری بھی۔ اس سے مدعو کی انانیت اور غرور میں مزید اضافہ ہوتا ہے اور وہ مسلم داعیوں سے متاثر اور مفتوح ہونے کے بجائے ان کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ آج اہل مغرب میں دعوت دین کا کام کرنا ہو تو وہاں کے حالات اور مدعو کی نفسیات کو پیش نظر رکھنا چاہیے جس میں ہماری رائے میں مندرجہ ذیل امور اہم ہیں:

i۔ مغرب کے موجودہ ذہن کی بنیاد عقلیت پر ہے، اس لیے وہاں دلیل اور منطق موثر ہوگی۔

ii۔ وہاں روحانی خلاء موجود ہے جسے پُر کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

iii۔ مسلمان اخلاقی، روحانی، دنیاوی ہر لحاظ سے کمزور ہیں اس لیے اس امر کا لحاظ رکھتے ہوئے اور اقرار کرتے ہوئے، دین اسلام کے وہ پہلو ان کے سامنے لانے چاہئیں جو ان کے موجودہ مسائل کا حل ثابت ہوتے ہوں۔

iv۔ ان کے ہاں متعصب حکمرانوں اور اسلام مخالف عناصر نے میڈیا اور پروپیگنڈے کے زور سے جو اسلام مخالف ماحول پیدا کر رکھا ہے، اس کا توڑ کرنا ہوگا۔

v۔ ابلاغ کا جو معیار مغربی دنیا کا ہے، مسلم داعیوں کو اس معیار پر پورا اترنا ہوگا۔ اس وقت کیفیت یہ ہے کہ پورے پاکستان میں ایک بھی ایسا تعلیمی ادارہ موجود نہیں جو ایسے افراد پیدا کر رہا ہو جو اسلامی علوم پر دسترس رکھنے کے ساتھ انگریزی زبان میں مہارت رکھتے ہوں اور مغربی علوم اور معاشرے کے تقاضوں کو بھی سمجھتے ہوں۔

vi۔ داعی کو انفرادی سطح پر اسلامی تعلیمات کا مجسم نمونہ بننا ہوگا۔

vii۔ مسلمان معاشرے میں کم از کم کسی ایک مسلم ملک میں اسلام کا سیاسی، معاشی، سماجی، قانونی اور تعلیمی نظام کامیابی سے چلا کر دکھانا ہوگا اور اس کے مثبت نتائج سامنے لانا ہوں گے۔

۳۔ ہمیں اہل مغرب کو یہ باور کرانا ہوگا کہ مسلمانوں کی جو معمولی اقلیت اہل مغرب کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی ہے، وہ محض مغرب کے ظلم و جبر کے ردعمل کی پیداوار ہے۔ گویا وہ بھی بنیادی طور پر دفاعی اور مدافعتی مہم ہے، اقدامی نہیں ہے۔ لہٰذا مغرب اگر مسلمانوں پر ظلم وستم سے باز آجائے، فلسطین، کشمیر، چیچنیا وغیرہ کے مسائل حل کرے اور مسلمان معاشروں کے مالی، سیاسی، تعلیمی، تہذیبی...... استحصال سے باز آجائے تو ان اقلیتی مسلمانوں کا ردعمل خود بخود ختم ہو جائے گا اور اگر ایسا نہ ہوا تو اقلیتی مسلمانوں کے اس ردعمل کو کوئی نہ روک سکے گا، نہ مغرب اور نہ ان کے ایجنٹ مسلمان حکمران، کیونکہ یہ لوگ اپنی جان و مال کی قربانی دینے پر تل گئے ہیں اور مسلمان عامۃ الناس کی ہمدردیاں بھی ان کے ساتھ ہیں۔

۴۔ مسلمان علماء اور دانشوروں کے اس طبقے کو جو مغرب سے مرعوبیت یا اپنی ابن الوقتی اور مفادات عاجلہ کے لیے مغرب اور مغرب کے ایجنٹ مسلم حکمرانوں کی مذکورہ بالا نزاع میں حمایت کرتا ہے، اسلام کی کتر بیونت کر کے اس کا کوئی نیا ایڈیشن پیش کرنے سے باز رہنا ہوگا۔ حالات بدلتے رہتے ہیں جبکہ اسلام کی تعلیمات ہمیشہ کے لیے ہیں۔

یہاں عامۃ الناس اور مخلص مسلمانوں کو ان 'تجدد پسندوں' کے اس دعوے کی حقیقت کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ چونکہ اسلام میں اجتہاد کی اجازت ہے اور معاملات میں شارع نے اپنی حکمت و دانش سے تفصیلی احکام نہیں دیے اس لیے مغرب کی تہذیبی پیش رفت کی روشنی میں، جو اللہ کے دیے ہوئے عقل وشعور پر مبنی ہے، اسلامی احکام کی تعبیر نو کی جاسکتی ہے اور معاملات میں مغربی تہذیب کا اتباع کیا جاسکتا ہے۔

یہ لوگ اگر حمیت، خودداری اور مردانگی کا داعیہ رکھنے والے ہوتے تو یہ سوچتے کہ ہم حالات کو بدلیں گے تاکہ وہ اسلام کے مطابق ہو جائیں لیکن چونکہ وہ ان صفات عالیہ سے محروم ہیں اور مغربی تہذیب کی چکا چوند سے ان کی آنکھیں خیرہ ہو چکی ہیں اس

لیے ان کوتاہ بینوں کا موقف یہ ہے کہ اسلام کو بدلو (اور اس کی ایسی تعبیر کرو) کہ وہ حالات کے مطابق ہو جائے یعنی وہی بات جو اقبال نے کہی تھی کہ ؎

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

بلاشبہ اسلام میں اجتہاد کی اجازت ہے اور لاریب شارع نے کمال مہربانی سے معاملات میں فروعی تفصیلات کا تعین نہیں کیا اور یہ حقیقت بھی تسلیم کہ کئی جمود پرست علماء اجتہاد کے ادارے کو تسلیم کرنے کے باوجود عملاً اس کا دروازہ بند رکھنے ہی کی روش اپنائے ہوئے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب کب ہے کہ ہم اجتہاد کا دوازہ اس طرح چوپٹ کھول دیں کہ غالب مغربی تہذیب کے ہر طرح کے غیر اسلامی افکار و احکام کو مشرف بہ اسلام کرلیں اور ''روشن خیالی، اعتدال، اور ترقی پسندی'' کے نام پر اسلام کا حلیہ بگاڑ دیں۔

ہم اس سے پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ موجودہ مغربی تہذیب اپنی بنیاد میں الحادی اور دین دشمن ہے۔ اور اس کا ورلڈ ویو اسلام کے ورلڈ ویو کے بالکل متضاد ہے اور وہ توحید، رسالت، آخرت اور وحی کی نفی پر مبنی ہے لہٰذا ہم آنکھیں بند کر کے مغربی افکار و احکام کو مشرف بہ اسلام نہیں کر سکتے۔ بلاشبہ اسلام میں عقل و شعور کا ایک کردار ہے اور یہ کردار اہم ہے لیکن یہ کردار ثانوی اور تبعی نوعیت کا ہے یعنی بالادستی وحی پر مبنی تعلیمات کی ہی رہتی ہے اور وہی حجت و سند رہتی ہیں اور عقل کا کردار تبعی اور ثانوی ہوتا ہے۔ عقل اسلام میں حجت و سند نہیں اور نہ اسے تعلیمات وحی پر غالب کیا جا سکتا ہے۔ اجتہادی امور میں، معاملات کی تفصیلات کے تعین میں اور نصوص شریعت کی تشریح و تطبیق میں، بلاشبہ عقل کا کردار مسلّم ہے لیکن وہ نصوص اور ان کی روح کے مطابق ہونا چاہیے، ان کی روشنی میں ہونا چاہیے، ان کے مقاصد کو پورا کرنے والا ہونا چاہیے نہ کہ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا۔ بھان متی نے کنبہ جوڑا۔

اسلام میں حالاتِ زمانہ کی رعایت بلاشبہ مقصود ہے لیکن اس رعایت سے یہ بہر حال مقصود نہیں ہے کہ ہر غالب تہذیب کے افکار و احکام کو، خواہ وہ اپنی شکل و روح میں غیر اسلامی ہی کیوں نہ ہوں، سند جواز عطا کر کے قبول کرلیا جائے۔ اس طرح کا منفعل اور مرعوب ذہن اسلام کو مطلوب نہیں ہے۔ ہمارا رویہ 'إلی الاسلام من جدید' کا ہونا چاہیے نہ کہ 'إلی الاسلام الجدید' کا۔ ہماری سپرٹ یہ نہیں ہونی چاہیے کہ ہمیں زندگی مغربی تہذہب کے مطابق گزارنی ہے کیونکہ وہ ترقی یافتہ ہے، مقبول ہے، عالمی ہے...... اور اسلامی تعلیمات جہاں اس کا ساتھ نہ دیں، ان کی ایسی تشریح کرنا ہے کہ وہ مغربی تعلیمات کے مطابق ہو جائیں۔ یہ بلاشبہ مرعوبیت اور گمراہی ہے۔ اس کے مقابلے میں ہمارا رویہ یہ ہونا چاہیے کہ ہم مسلم ہیں یعنی ہم اللہ کے عبد ہیں، بلاشرط اور بلا حدود اور ہمارا کام یہ ہے کہ اپنے آقا و مولا کے ہر حکم کے آگے ہر حال میں سر تسلیم خم کر دیں۔ ہاں، جہاں اس نے اپنی مہربانی سے ہمیں فکر و عمل کی آزادی دی ہے وہاں اس کی بتائی ہوئی حدود کے اندر اسے استعمال بھی کریں گے اور اپنے حالات اور ضروریات کی رعایت بھی ملحوظ رکھیں گے۔

ہم یقین سے کہتے ہیں کہ مذکورہ بالا دونوں رویوں کے نتائج مختلف ہوں گے۔ دوسرا رویہ وہ ہے جو اس امت کے جلیل القدر علماء نے ہمیشہ اختیار کیا اور اس کی وجہ سے اسلام ایک ہزار سال تک کامیاب طریقے سے کروڑوں لوگوں کا عملی دین (نظام زندگی) رہا ہے اور اس کے مطابق ترقی یافتہ مسلم معاشرہ قائم رہا ہے۔ اور پہلا رویہ وہ ہے جو متجددین نے اختیار کیا ہے۔ یہ متجددین پہلے زمانے میں بھی تھے جنھوں نے یونانی اور ایرانی فکر کے مطابق اسلام کو ڈھالنا چاہا اور آج کے زمانے میں بھی ہیں جو مغربی تہذیب کے مطابق اسلام کی کتر بیونت کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اسلام اور مسلمانوں کو ان کے شر سے بچائے۔

۵۔ اسلامی دعوت پہنچانے کا صرف یہی ایک طریقہ نہیں ہے کہ حالت امن میں

مسلمان کفار کے ممالک میں جا کر تقریریں کریں اور کتابیں بانٹیں بلکہ حالت جنگ میں بھی دعوت کا پیغام اپنے صالح عمل سے پہنچایا جا سکتا ہے جیسا کہ صلاح الدین ایوبی نے پہنچایا۔ یہاں تک کہ حالت شکست اور ضعف و مظلومی میں بھی دعوت کا پیغام صبر و حکمت سے پہنچایا جا سکتا ہے جیسا کہ صوفیاء نے منگولوں سے شکست کھانے کے بعد پہنچایا اور اس میں کامیاب ہوئے۔ اس بات کی توثیق کرتے ہوئے ایک مغربی محقق نے اعداد و شمار کی مدد سے لکھا ہے کہ مشرقی افریقہ خصوصاً تنزانیا میں اشاعت اسلام کا سب سے تیز رفتار زمانہ وہ تھا جب اہل مغرب نے وہاں ظلم و ستم کی انتہا کر رکھی تھی [1] اور یہ بات آج بھی ثابت شدہ ہے کیونکہ امریکہ خود تسلیم کرتا ہے کہ اسلام وہاں سب سے تیزی سے پھیلنے والا مذہب ہے، اس امر کے باوجود کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جھوٹا اور انتہائی زہریلا پروپیگنڈا وہاں زوروں پر ہے اور اسلام کے خلاف فضا وہاں بظاہر بہت معاندانہ ہے۔ اس سب کے باوجود نہ صرف امریکی اور یورپین مسلمان ہو رہے ہیں بلکہ ان میں سے بعض مسلمانوں کی مظلومیت دیکھتے ہوئے اہل مغرب کے مقابلے میں ان کا ساتھ دیتے ہیں اور جہاد میں خوشی خوشی اپنی جان قربان کر کے شہادت کا رتبہ بھی حاصل کر رہے ہیں۔ تو حقیقت یہ ہے کہ اسلام کو جتنا دبائیں یہ اتنا ہی ابھرتا ہے لہٰذا دعوت کے اس پہلو کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے۔

تلخیص مباحث و نتائج بحث

مغربی تہذیب کے بارے میں مسلمانوں کا رویہ کیا ہونا چاہیے؟ اس موضوع پر سوچتے ہوئے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس بارے میں مسلمانوں کے تین رویے ہو سکتے ہیں: مغربی تہذیب کو رد کر دیا جائے، اسے قبول کر لیا جائے یا اس سے مفاہمت کر لی جائے۔ ہم نے سطور بالا میں ان تینوں رویوں کے مؤیدین کے دلائل کا

۱۔ آکسفورڈ انسائیکلو پیڈیا آف ماڈرن اسلامک ورلڈ، ج ۴، ص ۱۸۲، آکسفورڈ یونیورسٹی، پریس، نیویارک ۱۹۹۵ء

تذکرہ کیا اوران کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے بارے میں اپنی رائے بھی تبصرے کے انداز میں شرح وبسط سے بیان کردی۔ان مباحث کو اگر ہم چند جملوں میں سمیٹیں تو اس کا اظہار یوں ہوسکتا ہے کہ:

۔ ہمیں مغربی تہذیب کو رد کردینا چاہیے کیونکہ اس کی فکری اساسات اور ورلڈویو ہماری فکری اساسات اور ورلڈویو کے بالکل متضاد ہے۔لہٰذا اگر ہم مغربی تہذیب قبول کرکے اس کی پیروی کریں گے تو اس کا نتیجہ ہوگا دنیا اور آخرت دونوں میں ناکامی اور خسران مبین۔

۔ اس دنیا میں ہماری کامیابی اور آخرت میں فلاح کا سائنٹفک اور مجرب نسخہ یہ ہے کہ ہم اپنے نظریۂ حیات (اسلام) سے محکم طور پر وابستہ ہوجائیں اور اس کے تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کریں۔

۔ لیکن مغربی تہذیب کو رد کرنے اور اپنے نظریے پر اصرار کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمیں مغرب سے سیاسی، معاشی یا اسلحی جنگ کرنا چاہیے۔ ہرگز نہیں، بلکہ ہمیں مغرب کے ساتھ مفاہمت اور ڈائیلاگ کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے تاکہ ہم کسی کشمکش میں الجھے بغیر اپنے نظریۂ حیات کے مطابق تیز رفتار ترقی کرسکیں۔

۔ لیکن اس مفاہمت کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ اگر کسی مسلم ملک پر حملہ ہو تو اس کی مزاحمت اور مدافعت نہ کی جائے۔نہیں! اپنے وجود اور نظریے کی حفاظت ہمیں ہر قیمت پر کرنا ہے جس کی اجازت ہمیں دنیا کا ہر قانون دیتا ہے۔لہٰذا یہ مدافعت ہمارے مفاہمت کے جذبے کی نقیض نہیں ہے۔

ہم مغربی تہذیب کو رد کرتے ہیں

ہم مغربی تہذیب کو رد کرتے ہیں
کسی تنگ نظری، تعصب، لاعلمی یا نفرت کی بنا پر نہیں
بلکہ علیٰ وجہ البصیرت
دلائل کے ساتھ

....

اس تہذیب کی اساس وحی کے انکار پر ہے۔
اس کے نزدیک حق صرف وہ ہے جسے دیکھا، ناپا اور تولا جاسکے
اس تہذیب کے نزدیک زندگی صرف اس دنیا ہی کی زندگی ہے
لہٰذا ہماری ساری تگ ودو اسی دنیا کے لیے ہونی چاہیے
اس دنیا میں کامیابی ہی ہمارا نصب العین ہونا چاہیے

....

اس تہذیب کے نزدیک خدا مر چکا ہے
انسان اپنا خدا آپ ہے
وہ آزاد ہے۔
وہ جو چاہے، وہ حق ہے
وہ جس کا انکار کردے وہ باطل ہے

....

اس انسان کا ہدف دولت وحشمت ہے
دنیا کی سہولتیں اور آسائشیں ہیں
جو یہاں کامیاب ہے، وہی کامیاب ہے

اس زندگی کے بعد کیا ہوگا؟ یہ کس نے دیکھا ہے؟
یہ محض افسانہ ہے!

....

اس کے برعکس ہم...... مسلمان
ہم بھی ایک سوچ اور فکر رکھتے ہیں
ہماری بھی ایک تہذیب ہے

....

ہم کہتے ہیں ہم عبد ہیں، آزاد نہیں
عبد ہیں اپنے رب کے
اور مستند ہے اس کا فرمایا ہوا
جو ہمارا خالق ہے
ہمارا پالن ہار ہے
جو سمیع و علیم ہے، جو خبیر و بصیر ہے
اس کی وحی برحق ہے، ہر چیز پر غالب ہے
دنیا کی زندگی چندروزہ ہے
اصل کامیابی تو آخرت کی کامیابی ہے
﴿ وَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ فَقَدْ فَازَ ﴾[1]

....

اور اس دنیا کی ساری حشمتیں اور کامیابیاں
آمنہ کے اس لعلؐ کی ایک نظر پہ فدا
جو ہمارا رہبر ہے

۱۔ ’’اور جو آگ کے عذاب سے بچ گیا وہی کامیاب ہے۔‘‘ (آل عمران ۳:۱۸۵)

جو ہمارا رہنما ہے
جس کی غلامی پہ ہمیں فخر ہے
جس کی غلامی ہماری آرزو ہے

....

ہماری زندگی تو یہ ہے
کہ جب ہم پہ تنگی آئی تو ہم نے صبر کیا
جب ہم پہ فراخی آئی تو ہم نے کہا: الحمدللہ
ہماری زندگی تو یہ ہے
کہ جب اس نے سینے پہ زخم کھایا اور گرا
تو اس نے چیخ کر کہا: 'فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ' (۱)
ہاں! یہی ہماری زندگی ہے
یہی ہماری کامیابی ہے
کہ ہمارا جینا اور مرنا ہمارے اللہ کے لیے ہے

....

تو اے دیدہ ورو!
مغرب کی ایک فکر ہے، اس کی ایک تہذیب ہے
اور ہماری بھی ایک فکر ہے اور ہماری بھی ایک تہذیب ہے
اور نہ یہ فکریں باہم ملتی ہیں، نہ تہذیبیں
ان کا حق ہمارا باطل ہے
اور ہمارا حق ان کا باطل ہے

۱۔ (رب کعبہ کی قسم، میں کامیاب ہو گیا (صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب من ینکب او یطعن فی سبیل اللہ)

'لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ' [1]

بلکہ یہ باہم متضاد ہیں
کبھی نہیں ملتیں، کہیں نہیں ملتیں، مل ہی نہیں سکتیں
ندی کے دو کناروں کی طرح

....

تو اے دیدہ ورو!

ہم مغربی تہذیب کو رد کرتے ہیں
کسی تعصب، تنگ نظری، لاعلمی یا نفرت کی بنا پر نہیں
بلکہ علیٰ وجہ البصیرت
دلائل کے ساتھ

❀❀❀❀❀❀

۱۔ (تمہارے لیے تمہارا دین اور ہمارے لیے ہمارا دین' (الکفرون:۱۰۶:۹)

حصہ دوم

مسلم معاشرے پر
مغربی تہذیب کے اثرات

پاکستانی تناظر میں

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

حرف اوّل

ایک طاقت ور تہذیب اور قوم جب ایک کمزور تہذیب اور قوم پر غلبہ پا لیتی ہے تو وہ محض ملک اور علاقے فتح نہیں کرتی بلکہ دل و دماغ بھی فتح کرتی ہے اور اپنی فتح اور غلبے کے استحکام اور استمرار کے لیے اس امر کی کوشش اور پلاننگ کرتی ہے کہ مغلوب تہذیب اور قوم کے دل و دماغ ہمیشہ مفتوح رہیں۔ وہ اس کی فکر اور تہذیب کو برتر سمجھیں، اس کے رسیا بن جائیں، اس کی پیروی کرنے لگیں اور اپنی فکر کو حقیر، کمتر اور ناقص سمجھیں اور اس پر عمل کی خواہش و کوشش نہ کریں۔ غالب تہذیب اور قوم فکری سطح پر یہ منہج اس لیے اختیار کرتی ہے تاکہ وہ مغلوب قوم پر اپنا سیاسی تسلط جاری رکھ سکے اور اس کا معاشی استحصال کرتی رہے۔

یہی کچھ مغربی اقوام نے مسلم ممالک کے ساتھ کیا۔ مسلم معاشرہ جب کمزور ہو گیا اور مغربی اقوام نے طاقت پکڑی تو انیسویں اور بیسویں صدی میں مغربی قوموں نے مسلم ممالک پر قبضہ کر لیا[1] اور پھر ساتھ ہی ان کے دل و دماغ کو فتح کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ انہوں نے مسلمانوں کا نظام تعلیم ختم کر کے مغربی نظام تعلیم رائج کیا، نصاب بدلا، ذریعۂ تعلیم بدلا، تعلیمی اداروں کا ماحول بدلا، تربیت کا انداز بدلا اور لارڈ میکالے کی وضع کردہ پالیسی کے مطابق ایسے مسلمان پیدا کرنے شروع کیے جو نام کے تو مسلمان ہوں لیکن فکری و عملی لحاظ سے مغربی تہذیب کے رسیا اور پیروکار ہوں۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی مزاحمت کی آخری بڑی کوشش کی ناکامی کے بعد خود

۱۔ یہاں قاری کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ مسلم معاشرہ کیوں کمزور ہو گیا اور مغربی اقوام کیسے طاقتور ہو گئیں؟ ان سوالوں کے تفصیلی جواب کے لیے دیکھیے ہماری کتاب ''مسلم نشأۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل، کتاب سرائے، اردو بازار، لاہور۔

بعض مسلمانوں نے (سرسید احمد خاں کی سربراہی میں) ایسے تعلیمی ادارے قائم کرنا شروع کر دیے جنھوں نے عملاً لارڈ میکالے کی مذکورہ پالیسی پر عمل کرتے ہوئے اسے آگے بڑھایا اور آج ''اسلامیہ جمہوریہ پاکستان'' میں سارے سکول، کالج اور یونیورسٹیاں علی گڑھ کے اسی ماڈل کے مطابق کام کر رہی ہیں اور دوسری طرف دینی مدارس ایسے علما پیدا کرتے چلے آرہے ہیں جو محض مسجد و مدرسے تک محدود ہیں اور معاشرے کے نظام کو چلانے میں جن کا کوئی کردار نہیں ہے۔

سیاسی میدان میں استعماری قوتوں کو جب مسلم ممالک سے نکلنا پڑا (جس کی وجہ مسلمانوں کی مزاحمت اور دوسری جنگ عظیم کے نتیجے میں ان کی داخلی شکست و ریخت تھی) تو انہوں نے اقتدار بالعموم ایسے لوگوں کے سپرد کیا جو ان کے قائم کردہ تعلیمی اداروں کے تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ تھے اور مغربی تہذیب کے شائق و رسیا تھے۔ چنانچہ انہوں نے مسلم معاشرے میں مغربی فکر و تہذیب کو رائج کرنے میں دلچسپی لی اور قومی زندگی خصوصاً نظام تعلیم اور سیاسی نظام کو اسلامی تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی نہ صرف یہ کہ کوئی کوشش نہ کی، بلکہ الٹا حیلے بہانے اس کی مخالفت اور مزاحمت کی اور اس کے علم برداروں پر ظلم و ستم ڈھائے اور انہیں ناکام بنانے کے لیے مغربی قوتوں کی اشیر باد سے ریاستی قوت استعمال کی۔ انہوں نے مغربی ایجنڈے کو آگے بڑھاتے ہوئے نظام تعلیم، ذرائع ابلاغ اور دوسرے سارے شعبہ ہائے حیات میں مغرب پرست پالیسیوں کو نافذ اور رائج کیا۔

ان حالات کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشہور عربی کہاوت کے مطابق کہ ''**الناس علی دین ملوکھم**'' عام لوگ حکمرانوں کی مغرب پرست پالیسیوں سے متاثر ہوتے رہے جس کی وجہ سے مسلم معاشرے میں مغربی تہذیب کی پیروی کے رجحان کو تقویت ملی اور خود نظام تعلیم اور ذرائع ابلاغ کو جب پرائیویٹ سیکٹر میں کام کرنے کی آزادی ملی تو اس نے بھی مغرب پرستی کی روش جاری رکھی۔

ان سارے عوامل کا نتیجہ یہ نکلا کہ علما اور دینی عناصر کی کوششوں کے باوجود اور اس بات کے علی الرغم کہ پاکستانی مسلمان بالعموم اسلامی احکام پر عمل کرتے ہوئے زندگی گزارنا چاہتے ہیں، اسلامی تقاضوں کو پورا کرنا چاہتے ہیں اور عیسائیت، سیکولرزم، بے پردگی، بے حیائی اور بحیثیت مجموعی سارے غیر اسلامی رسوم ورواج کو ناپسند کرتے ہیں، معاشرے میں عملاً یہ کیفیت ہے کہ مغربی تہذیب کے رسم ورواج پر شعوری وغیر شعوری طور پر عمل ہو رہا ہے اور بہت سی چیزیں بتدریج آہستہ آہستہ ان کی روزمرہ زندگی کا اس طرح حصہ بن گئی ہیں کہ اب انہیں اور خصوصاً نئی نسل کو ان کے بارے میں غیریت اور اجنبیت بھی محسوس نہیں ہوتی۔

ہمارا موقف یہ ہے کہ مغربی تہذیب اسلام مخالف ہے اس کی فکری اساسات (ہیومنزم، سیکولرزم، لبرلزم وغیرہ)، علمی مناہج (وحی کی برتری تسلیم نہ کرنا اور عقل، حس اور تجربے کو مدار علم وحق سمجھنا) اور اس کا ورلڈ ویو (دنیوی زندگی گزارنے میں اللہ اور دین کا کوئی کردار نہ ماننا اور انسان کو مختار مطلق سمجھنا کہ وہ جیسے چاہے زندگی گزارے) اسلام سے بالکل مختلف بلکہ اس کے متضاد ہے۔ اور اس سے بڑھ کر مغربی طاقتوں کا عملی رویہ پہلے دن سے لے کر آج تک مسلم اور اسلام دشمنی پر مبنی ہے۔ صلیبی جنگیں، مسلمانوں کو باہم لڑانے کی سازشیں (عربوں کو ترکوں سے لڑایا)، مسلمان ملکوں کو غلام بنانا، ان کا سیاسی اور معاشی استحصال، اور حال ہی میں افغانستان اور عراق پر قبضہ اور ظلم وستم اور فلسطین وکشمیر وچیچنیا و بوسنیا میں مسلم دشمن قوتوں کا ساتھ دینا...... وغیرہ اس کے چند بڑے مظاہر ہیں۔

دوسری طرف مسلمانوں کے زوال کے موجودہ گرداب سے نکلنے، ترقی کرنے اور مضبوط ہونے کی واحد اساس ہمارے نزدیک یہ ہے کہ وہ اپنے نظریۂ حیات (اسلام) سے مستحکم طور پر وابستہ ہو جائیں اور اپنے نظام تعلیم وتربیت، سیاسی نظام، معاشرتی ڈھانچے اور دیگر شعبہ ہائے حیات کی اسلامی تعلیمات کے مطابق تشکیل نو

کریں اور ان کے مطابق زندگی گزاریں اور نہ صرف یہ بلکہ مغربی فکر و تہذیب کو رڈ کر دیں اور اس کے سارے تخریبی اثرات کو اپنی زندگیوں سے مٹا دیں۔

ان حالات میں ہم اس امر کی ضرورت عرصے سے محسوس کر رہے تھے کہ ان رسوم و رواج اور مظاہر کی واضح نشان دہی کی جائے جو اپنی اصل میں مغربی فکر و تہذیب پر مبنی ہیں اور اپنی روح مین غیر اسلامی ہیں تا کہ ان کی یہ حیثیت عوام و خواص پر واضح ہو جائے اور جو لوگ اسلامی فکر و نظر کے مطابق زندگی گزارنا چاہتے ہیں وہ انہیں اپنی زندگی سے خارج کر سکیں۔

ہم نے آئندہ سطور میں جو کچھ لکھا ہے وہ اس سلسلے کی ایک ابتدائی کاوش ہے۔ ممکن ہے اس میں ساری باتوں کا حصر نہ ہو سکا ہو، لیکن ہمیں توقع ہے کہ اس میں اکثر اہم باتوں کی نشان دہی ہو گئی ہے اور ہمیں امید ہے کہ جن سچے مسلمانوں کے ہاتھوں تک یہ تحریر پہنچے گی وہ مغربی فکر و تہذیب پر مبنی ان مظاہر اور رویوں کو اپنی زندگیوں سے باہر نکال پھینکنے کے لیے پوری جدو جہد کریں گے۔ کیا ہمارے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ ہم ہر معاملے میں اللہ کی کتاب کے بتائے ہوئے رستے پر چلیں اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کریں اور ہر اس چیز کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے باہر نکال پھینکیں جو اللہ اور رسولؐ کے بتائے ہوئے احکام کے خلاف ہے؟ ذلت و نکبت کے جس گڑھے میں ہم گرے ہوئے ہیں اور ظلم و ستم کے جو پہاڑ ہم پر توڑے جا رہے ہیں کیا اس کے بعد بھی ہم نہیں جاگیں گے اور کیا اس کے بعد بھی ہم خود کو نہیں بدلیں گے؟ اور کیا اب بھی ہم اس کے لیے تیار نہیں کہ ہم:

احکام الٰہیہ کی اطاعت کریں (۱)

اور مکمل یکسوئی سے کریں (۲)

۱۔ الحدید ۵۷: ۱۶

۲۔ الروم ۳۰: ۳۰

اور زندگی کے سارے معاملات میں کریں [۱]

اور کفار اور اہل کتاب کی پیروی سے باز آ جائیں [۲]

تا کہ ہم دنیا میں بھی کامیاب ہوں [۳]

اور آخرت میں بھی کامیاب ہوں [۴]

اور اصل کامیابی تو آخرت ہی کی کامیابی ہے [۵]

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو اسلام پر چلنے اور کفار و مشرکین کی پیروی سے بچنے کی توفیق عطا فرمائیں (آمین یا رب العالمین)۔

۱۔ البقرہ ۲: ۲۰۸

۲۔ آل عمران ۳:۱۴۹

۳۔ ھود ۱۱: ۵۲

۴۔ مریم ۱۹:۶۰

۵۔ آل عمران ۳:۱۸۵

مبحث اوّل

مسلم معاشرے پر مغربی تہذیب کے اثرات: اسباب ومظاہر

مغربی تہذیب مسلمان معاشرے پر شدت سے اثر انداز ہوئی ہے۔ اس کے اسباب ومظاہر کئی ایک ہیں:

۱۔ مسلمان جب تک اپنے دین سے محکم طور پر وابستہ رہے تو اس کے نتیجے میں ان کے اندر وہ خوبیاں خود بخود پیدا ہوگئیں جو دنیا میں اقتدار اور عزت وسربلندی کے لیے ضروری ہیں جیسے اتحاد، محنت، تنظیم ومنصوبہ بندی، پابندئ قانون، ایثار وقربانی وغیرہ نیز انہوں نے تعلیم وتربیت، دعوت، تحقیق اور سیاسی استحکام کے ذریعے سائنس و ٹیکنالوجی میں ترقی کی، معاشی استحکام حاصل کیا، صنعت وتجارت میں چھا گئے اور اسلحی قوت میں دوسری قوموں پر برتری حاصل کرلی۔ چنانچہ ان سب کے نتیجے میں مسلم تہذیب اپنے زمانے کی ساری تہذیبوں پر غالب آگئی اور ہر سو اس کی عظمت وسطوت کا پھریرا لہرانے لگا۔

پانچ سو سال بعد منگولوں کی یلغار نے اسے شدید جھٹکا پہنچایا اور دجلہ وفرات کا پانی ان کے لہو سے رنگین ہوگیا اور سلطنت خوارزم میں جگہ جگہ ان کی کھوپڑیوں کے مینار کھڑے ہوگئے۔ لیکن ابھی تک مسلم تہذیب میں دم خم باقی تھا چنانچہ بہت جلد اس کی طاقتور فکر نے فاتحین کو فتح کرلیا اور وحشی تاتاریوں نے اسلام کے دامن میں پناہ لینے میں عافیت جانی۔ اس جھٹکے سے سنبھل کر مسلم تہذیب مزید پانچ سو سال نکال گئی لیکن اٹھارویں صدی (عیسوی) تک آتے آتے مسلم معاشرے کے دینی واخلاقی انحطاط نے ان کے اندر وہ کمزوریاں پیدا کردیں جو دنیا میں عزت وعظمت کی نقیض ہیں اور ان کے جسد ملت کو وہ بیماریاں لاحق ہوگئیں جو ان کی تعمیری صلاحیتوں کو چاٹ گئیں۔ چنانچہ ان کے اندر کاہلی، کام چوری، نااتفاقی، خودغرضی وبزدلی، قانون شکنی اور فقدان تنظیم ومنصوبہ بندی نے جنم لیا اور صحیح تعلیم وتربیت سے اغماض، تحقیق سے

اعراض، کمزور ابلاغ اور سیاسی عدم استحکام نے انہیں معاشی وحربی طور پر کمزور کر دیا اور سماجی و سائنسی علوم میں پیش رفت سے وہ تہی دامن ہو گئے۔ مغرب کی حریف قوتیں اسی انتظار میں تھیں کہ کب یہ پہلوان کمزور ہو اور وہ اسے دبوچیں۔ چنانچہ انہوں نے سازشیں شروع کر دیں، مسلمانوں کو باہم لڑا کر مزید کمزور کیا اور بتدریج مسلم ممالک پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔

اور جیسا کہ دستور ہے کہ فاتح قومیں صرف ملک فتح نہیں کرتیں، مفتوحین کے دل و دماغ کو بھی فتح کرتی ہیں اور اہل مغرب نے تو مسلمانوں سے ایک لمبی آویزش میں شرم ناک شکستیں کھائیں تھیں لہٰذا ان کے اندر مسلمانوں سے نفرت و انتقام اور ان کو ملیا میٹ کرنے کا جذبہ بہت شدید تھا جس کی ایک مثال یہ ہے کہ پہلی جنگ عظیم میں شام پر قبضے کے بعد انگریز سپہ سالار نے صلاح الدین کی قبر کو ٹھڈے مارتے ہوئے کہا تھا "اٹھو صلاح الدین! ہم آ گئے ہیں"۔ چنانچہ ان کی شدید خواہش تھی کہ وہ مسلمانوں کو اس طرح سیاسی طور پر کچلیں اور فکری لحاظ سے تبدیل کر دیں کہ وہ دوبارہ کبھی نہ اٹھ سکیں۔ چنانچہ انہوں نے غصے، نفرت اور انتقام کے ابتدائی مظاہرے کے بعد مسلم فکر و تہذیب کو ختم کرنے اور مٹانے کے لیے ٹھنڈے دماغ سے سنجیدہ منصوبہ بندی کی۔ مسلمانوں کے نظامِ تعلیم و تربیت کو ختم کر کے اپنی مرضی کا تعلیمی نظام کھڑا کیا، ذریعہ تعلیم بدلا، نصاب بدلا، قانونی ڈھانچے اور عدالتی نظام کو ختم کیا، ان کے معاشرتی اوضاع میں تبدیلی کے لیے کوششیں کیں، عیسائی مشنریوں کی یلغار کرائی، مسلمانوں کے اندر جعلی نبوت پیدا کی ...... غرض انہوں نے مسلمانوں کے دل و دماغ کو بدلنے کے لیے ساری قوتیں لگا دیں اور ہر وہ حربہ اختیار کیا جو موثر ہو سکتا تھا۔

۲۔ مغرب جب مسلم معاشرے پر قبضہ کرنے اور اسے شکست دینے کے لیے جنگ کر رہا تھا تو مسلمان حکومتوں نے حتی المقدور مدافعت کی۔ عوامی سطح پر علما اور دینی عناصر نے خاص طور پر مزاحمت کی اور سخت مقابلہ کیا۔ فوجی میدان میں شکست کھانے اور ان

کے علاقوں پر مغربی استعمار کے قبضے کے بعد بھی مسلمان خاموش نہیں بیٹھ گئے بلکہ غلامی چونکہ ان کے فکری وتہذیبی مزاج ہی کے خلاف اور ان کے لیے ناقابل قبول تھی، اس لیے انہوں نے سامراج کی مزاحمت جاری رکھی۔ کچھ لوگوں نے سیاسی میدان میں اور کچھ لوگوں نے تعلیمی وفکری میدان میں۔ حسب سابق علما یعنی مسلمانوں کی مذہبی قیادت کا کردار اس میں نہایت اہم اور فعال تھا۔

فکری میدان میں اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے دو رویے سامنے آئے۔ ایک مغرب سے مرعوبیت اور اس کی پیروی کا اور دوسرا اس کی مزاحمت کا۔ پہلے رویے کے حامل مسلمانوں نے بھی، ظاہر ہے، اپنا دین نہیں چھوڑا بلکہ یہ کہا کہ اہل مغرب کی اچھی عادتیں اور خوبیاں مسلمانوں کو اپنا لینی چاہئیں، ان کے علوم سیکھنے چاہئیں، سائنس و ٹیکنالوجی میں ان سے استفادہ کرنا چاہیے، ان کے ساتھ امن ومفاہمت سے رہنا چاہیے اور ان کے بہتر طرز زندگی کی پیروی کرنی چاہیے۔ گویا اس رویے کے حامل لوگوں نے مغربی تہذیب کو نہ صرف قبول کرلیا بلکہ مسلمانوں کو اس کی پیروی پر اکسایا اور اس پر عمل کی دعوت دی۔ اس رویے کے سرخیل برصغیر میں سرسید احمد خان اور ان کے ہمنوا تھے۔

دوسرا فکری رویہ ان اہل فکر ونظر کا تھا جنہوں نے مغربی فکر وتہذیب کو رد کردیا، اسے اپنانے سے انکار کیا اور اسلامی فکر اور مقامی سماجی رویوں کو اپنائے رکھنے کے لیے جدوجہد کی۔ لیکن یہ عناصر پوری طرح معاشرے کو اس نقطۂ نظر پر کاربند رکھنے میں کامیاب نہ ہوسکے کیونکہ اقتدار ان کے پاس نہ تھا اور ریاستی قوت ان کی مزاحم تھی۔ پھر مغرب پسند عناصر مغربی قوتوں کی اشیر باد کے ساتھ اپنے نظریات پھیلانے اور نافذ کرنے کے لیے سرگرم تھے۔ علاوہ ازیں دیگر انحراف پسند نظریات کے حامل گروہ جیسے کمیونسٹ، سوشلسٹ، قادیانی، سیکولرسٹ، دین بیزار، نفس پرست دنیا دار...... وغیرہ بھی بظاہر مسلمان ہونے کے باوجود اسلامی سمت میں کسی حقیقی پیش رفت کے لیے تیار نہ تھے۔

پھر ان سب پر مستزاد یہ کہ جو دینی عناصر مغربی فکر و تہذیب کی شعوری مزاحمت کر رہے تھے وہ بھی اپنے موقف میں کئی مواقع پر غیر شعوری طور پر مغربی فکر و تہذیب سے متاثر ہو گئے مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی کا سیاسی فکر و عمل میں ہندوؤں سے اشتراک، علامہ مشرقی کا خلافت ارضی کے لیے مغرب کی صالحیت کا اقرار بلکہ مدح، اقبال کا تجدید دین کا تصور جس میں سنت سے اعراض اور نئی فقہ کی تدوین پر زور ہے، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا دین کو ایک دنیاوی نظام اور تحریک بنا کر پیش کرنا اور مولانا محمد الیاس کا ایک ایسی دینی تحریک کھڑی کر دینا جو دنیاوی معاملات سے اعتناء ہی نہیں کرتی ...... وغیرہ۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ مزاحمت نہ تو متحدہ تھی اور نہ زندگی کے سارے شعبوں میں موثر تھی کیونکہ دینی عناصر اپنی کم نگہی کے سبب فروعی اختلافات بھلا کر اس عظیم مقصد کے لیے اکٹھے نہ ہو سکے اور ہر فریق سے جو بن پڑا وہ اس میں لگا رہا۔ دوسرے یہ کہ کچھ عناصر سیاسی میدان میں کام کرتے رہے اور جنہوں نے تعلیم و تربیت کے میدان میں کام کیا وہ بھی ادھورا اور ناقص، لہٰذا وہ بھی زیادہ موثر نہ رہا۔ ان داخلی، ایمانی، فکری اور تعلیمی و تربیتی کمزوریوں نے مغربی فکر و تہذیب کی مزاحمت کو بے اثر بنا دیا۔

ان حالات میں مغربی فکر و تہذیب کے بہت سے عناصر بتدریج مسلم معاشرے میں سرایت کر گئے۔ یہ تداخل چونکہ فوری اور ہنگامی نہ تھا بلکہ بتدریج ہوا اور تھوڑا تھوڑا کر کے طویل برسوں میں اس کی پیش رفت ہوئی، اس لیے یہ بہت نمایاں نہ ہو سکا اور نہ کسی کی اس پر اس طرح نظر پڑی کہ کوئی ہنگامہ اٹھتا، اور کبھی کوئی ہنگامہ اٹھا بھی تو وہ وقتی تھا اور اس نے محض تھوڑی دیر کے لیے بریک کا کام کیا ورنہ مغربی فکر و تہذیب کے سیلاب کی تند و تیز لہریں اس کمزور بند سے مسلسل ٹکراتی رہیں اور بند کی مٹی خاموشی سے، تسلسل سے اور آہستگی سے اس کی نمی کو جذب کرتی رہی اور آج یہ بند ٹوٹتا نظر آ رہا ہے بلکہ کئی جگہ سے ٹوٹ چکا ہے اور خود دینی عناصر اور ان کے گھر اور ان کی اولادیں اس

سیلاب میں بہتی چلی جارہی ہیں حالانکہ زبان سے وہ اب بھی اس کی مذمت کررہے ہیں اوراس کے خلاف بیانات اورفتوے دے رہے ہیں۔

اس صورت حال کے مظاہر مسلم معاشرے میں عام ہیں اور عام لوگ تو رہے ایک طرف اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کو جودین پسند ہیں اوردینی اقدار پرعمل کرنے کے خواہاں ہیں اور مغربی فکروتہذیب کواچھانہ سمجھنے کے مدعی ہیں، وہ بھی بلا جھجک ان مغربی تصورات و تہذیبی مظاہرکواپنائے ہوئے ہیں اوران کواحساس تک نہیں ہوتاکہ وہ کیا کررہے ہیں؟

تھا جو نا خوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہےقوموں کاضمیر

ان حالات میں یہ ضرورت محسوس ہوتی تھی کہ زندگی کے ہر شعبے میں ان تصورات ومظاہرکی نشان دہی کی جائے جومغربی فکروتہذیب کی خوشہ چینی پرمبنی ہیں، غیر اسلامی ہیں اور ہمارے مقامی رسم ورواج کے بھی خلاف ہیں۔اوریادرہے کہ مقامی اعراف اور رسوم و رواج جن سے طبیعتیں مانوس ہوں، اگر وہ اسلامی تعلیمات کے خلاف نہ ہوں،تو وہ بھی شرعی لحاظ سےمحمودومطلوب ہوتے ہیں۔ (۱) ہم اس تحریر میں بالعموم ان تصورات و مظاہر کی محض نشان دہی پر اکتفا کریں گے لیکن جہاں ہم نے محسوس کیا کہ ہماری بات اتنی نامانوس ہے کہ لوگوں کے حلق سے نہ اترے گی تو وہاں ہم اپنے موقف کی کچھ وضاحت بھی کردیں گے تاکہ بات قارئین کی سمجھ میں آجائے اور وہ اس سے مرعوب ہوکر اختیار کیے گئے تصورات، اصطلاحات اور اعمال کو چھوڑ کر اسلامی تعلیمات اور ان کے تقاضوں کی طرف لوٹ سکیں۔ چنانچہ آیئے زندگی کے مختلف شعبوں میں غیر محسوس انداز میں گھسے ہوئے ان مغربی تصورات، اصطلاحات اورمظاہرکاایک جائزہ لیں اورابتداکرتے ہیں تعلیم وتربیت سے۔

۱۔ ابن قیم،اعلام الموقعین ،ج۳،ص۹ ،مطبعۃ السعادۃ،القاھرہ۱۹۵۵ء

مبحث دوم

مغربی تہذیب کے اثرات، مختلف شعبہ ہائے حیات میں
تعلیم وتربیت

جدید تعلیم

تعلیم ایک کاروبار

اسلام میں تعلیم کاروبار نہیں خدمت اور مشن ہے۔ مغربی تہذیب کے اثر سے پہلے مسلم معاشرے میں پچھلی چودہ صدیوں میں تعلیم کبھی مال تجارت نہیں رہی۔

تعلیم پر حکومت اور بیوروکریسی کا کنٹرول

مسلم روایت میں تعلیم علماء اور اساتذہ کے کنٹرول میں تھی نہ کہ حکمرانوں اور بیوروکریسی کے کنٹرول میں۔

تعلیم کو کاروبار بنانے کے نقصانات

- اہم مضامین سے اعراض

جتنی نئی یونیوسٹیاں اور تعلیمی ادارے پرائیویٹ سیکٹر میں کھل رہے ہیں، وہ ایسے مضامین پڑھاتے ہیں جن میں طلبہ کو مستقبل میں اچھی ملازمت کی ترغیب دے کر ان سے زیادہ سے زیادہ فیس بٹوری جاسکے مثلاً کمپیوٹر، بزنس مینجمنٹ، کامرس، انجینئرنگ، میڈیکل وغیرہ۔ اسلامی علوم (قرآن، حدیث، فقہ) مشرقی علوم (جیسے فارسی وعربی) اور اجتماعی وسماجی علوم (جیسے تاریخ، فلسفہ، سیاسیات وغیرہ) کوئی نہیں پڑھاتا۔ پبلک سیکٹر یونیورسٹیوں میں بھی ان مضامین کو نظر انداز کیا جارہا ہے حالانکہ یہی مضامین ذہن سازی اور تعمیر شخصیت کا کام کرتے ہیں۔

- جہالت کا راستہ

تعلیم مہنگی ہے اور فیسیں زیادہ ہیں۔ نتیجہ یہ کہ تعلیم کم ہے اور قوم جاہل رہے گی۔

- ناقص معیار

کاروبار کا مقصد اور اصول ہوتا ہے زیادہ سے زیادہ منافع کماؤ یعنی آمدنی زیادہ رکھو اور خرچ کم کرو۔ چنانچہ تعلیمی معیار کے زوال کا ایک بڑا سبب یہ منافع خوری کا رویہ ہے جس کا تقاضا ہے کہ اساتذہ کو تنخواہ تھوڑی دو (یعنی کم تعلیم یافتہ اور نا تجربہ کار استاد رکھو) طلبہ کو سہولتیں کم دو، تعلیمی ادارے کے ماحول کو بہتر بنانے پر کم خرچ کرو اور یوں مال بناؤ۔

- ٹیوشن

اساتذہ سکولوں میں پڑھاتے ہی نہیں۔ ان کا مطالبہ ہوتا ہے کہ طلبہ گھر آ کر ان سے ٹیوشن پڑھیں تا کہ ان کی جیب میں مزید مال آئے۔

- استاد شاگرد تعلق

طلبہ کے دل میں اساتذہ کے لیے محبت اور احترام نہیں رہا۔ آج سے تیس چالیس سال پہلے ٹیوشن کا کسی نے نام تک نہیں سنا تھا آج تقریباً سارے بچے شام کو ٹیوشن پڑھنے جاتے ہیں کیونکہ استاد شاگرد کا تعلق محض کاروباری ہو کر رہ گیا ہے۔ طالب علم پیسے دیتا ہے اور پڑھتا ہے، استاد پیسے لیتا اور پڑھاتا ہے۔ اسلامی روایت میں استاد معلم ہی نہیں مربی بھی تھا۔ طلبہ اس کو آئیڈیالائز کرتے تھے، اس جیسا بننا چاہتے تھے اور اساتذہ بچوں کے کردار سنوارنا اور انہیں اچھا مسلمان اور انسان بنانا اپنا مقصد زندگی سمجھتے تھے لیکن استاد شاگرد میں نئے کاروباری تعلق نے تربیت کا یہ تصور ہی ختم کر دیا ہے۔

تعلیم کا مقصد: ملازمت

اسلامی روایت میں تعلیم کا مقصد خدا شناسی اور خود شناسی تھا۔ چنانچہ تعلیم حاصل کی

جاتی تھی اچھا مسلمان بننے کے لیے، اچھا انسان بننے کے لیے، تہذیب نفس کے لیے، اعلیٰ فکری و تہذیبی اقدار کے حصول کے لیے۔ اب تعلیم کا ایک ہی مقصد ہے ملازمت، ملازمت اور ملازمت۔ ہمارے اسلاف ملازمت خصوصاً سرکاری ملازمت کو بہت برا سمجھتے تھے اور کسب معاش کے لیے تجارت و حرفت کو معزز سمجھتے تھے۔ امام ابو حنیفہؒ نے کوڑے کھائے لیکن سرکاری ملازمت نہ کی اور جج بننا منظور نہ کیا۔ پچھلی صدی میں علماء و نجباء علی گڑھ کو اس لیے بھی برا سمجھتے تھے کہ یہاں پڑھنے والوں کا بڑا مقصد اور مصرف (انگریز کی) سرکاری ملازمت تھا۔

بیچاری دینیات کی کتاب

ہمارا سارا نصاب مغربی نصابات کا چربہ ہے بلکہ سارا نظام تعلیم ہی مغرب کی فکری اساسات پر قائم ہے۔ مسلمان عوام کی اشک شوئی کے لیے اور ان کو یہ تاثر دینے کے لیے کہ ہمارا نظام تعلیم ''اسلامی پہلو'' بھی رکھتا ہے، ایک چھوٹی سی دینیات کی کتاب کا نصاب میں اضافہ کر دیا جاتا ہے تاکہ کچھ 'مذہبی تعلیم' بھی مسلمان بچوں کو مل جائے۔ اسلام کو عملی زندگی سے کاٹنے اور غیر موثر بنانے کا یہ تیر بہدف نسخہ ہے کیونکہ اس سے اسلام بحیثیت دین اور نظریۂ حیات سامنے ہی نہیں آتا اور نہ فکری و تہذیبی لحاظ سے موثر کردار ادا کر سکتا ہے۔

انگلش میڈیم (یعنی انگریزی ذریعۂ تعلیم)

اگر کوئی انگریزی زبان سیکھنا چاہے کہ یہ سائنس کی اعلیٰ تعلیم اور بین الاقوامی تجارت اور روابط میں کام آتی ہے تو اس میں اعتراض کا کیا محل ہے؟ لیکن انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنانا کہ اس کے ذریعے سارے مضامین پڑھے جائیں۔ اس کی کیا تک ہے؟

نرسری سے انگریزی زبان سکھانا

یہ ایک بین الاقوامی طور پر مسلمہ حقیقت ہے کہ زبان انتقال فکر و ثقافت کا ذریعہ

ہوتی ہے اور ہر زبان کسی نہ کسی فکر اور تہذیب کی نمائندہ ہوتی ہے۔ جس طرح برصغیر میں اردو مسلمانوں کی زبان اور سنسکرت ہندوؤں کی زبان سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح انگریزی بڑی حد تک مغربی فکر و تہذیب کی نمائندہ زبان ہے اور اس کی اس حیثیت سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دنیا بھر میں ثانوی زبان اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے بوقت ضرورت سکھائی جاتی ہے یا زیادہ سے زیادہ سیکنڈری سکول تعلیم کے بعد جب کسی طالب علم کے تخصص میں اس کی ضرورت ہو۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ پہلے طالب علم اپنی زبان میں وہ علوم سیکھ لے جو اس معاشرے کی فکر اور عقائد کے مطابق اس کے ذہن اور فکر و عمل کی تشکیل کرتے ہیں، اس کے بعد وہ دوسری زبان اور دوسرے علوم سیکھے۔ لیکن ہمارے ہاں یہ طرفہ تماشا ہے کہ بچہ ابھی بولنا سیکھ رہا ہوتا ہے تو اس وقت سے اسے انگریزی زبان سکھانا شروع کر دی جاتی ہے۔ ایسا وہی معاشرہ کر سکتا ہے جو غلامانہ ذہنیت رکھتا ہو اور آئندہ نسل کو بھی غلام رکھنا چاہتا ہو۔ اور پاکستان میں نظامِ تعلیم کی تشکیل جن ہاتھوں میں ہے وہ ذہنی طور پر مغرب کے غلام ہی ہیں اور آئندہ نسل کو بھی غلام ہی رکھنا چاہتے ہیں ورنہ کسی زندہ قوم سے اس غلامانہ حرکت کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنے بچوں کو تین چار سال کی عمر میں ایک غیر تہذیب کی نمائندہ زبان سکھانے کا اہتمام اور اس پر اصرار کرے۔ اگر آپ کو ہمارے اس موقف میں شک ہو تو کسی امریکی یا فرانسیسی سے یہ کہہ کر دیکھیے کہ وہ اپنے بچے کو چار پانچ سال کی عمر سے اردو سکھانا شروع کر دے تو ممکن ہے وہ آپ کو مینٹل ہسپتال چھوڑ آئے یا مکہ مار کر آپ کی بتیسی نکال باہر کرے۔

ڈے کیئر، کنڈر گارٹن اور مونٹی سوری......

اسکول کی باقاعدہ تعلیم سے پہلے چھوٹے بچوں کے لیے اس طرح کے تعلیمی اداروں کا قیام مغربی معاشرے کا مسئلہ ہے جہاں تقریباً ہر عورت کو اپنا پیٹ پالنے کے لیے ملازمت کرنی پڑتی ہے۔ جب اسے ملازمت پر جانا ہے اور گھر کے کام کاج بھی

کرنے ہیں تو بچے کون پالے؟ اس کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ ایسے تعلیمی ادارے بنائے جائیں جہاں سکول کی باقاعدہ تعلیم سے پہلے چھوٹی عمر کے بچے اس طرح پالے جائیں کہ کچھ ان کی تعلیم بھی ساتھ ساتھ ہوتی رہے۔ لیکن ظاہر ہے یہ مسلم معاشرے کا مسئلہ ہے ہی نہیں۔ مسلم روایت میں عورت گھر سنبھالتی، بچے پالتی اور ان کی تربیت کرتی ہے اور براہ راست معاشی سرگرمی (ملازمت وغیرہ) میں نہیں پڑتی (سوائے استثنائی حالات کے) تو مسلم معاشرے میں اس پری سکول تعلیم وتربیت کے لیے تعلیمی اداروں کے قیام کا تصور ہی غلط ہے۔

گلی گلی انگلش میڈیم سکول

ذرا بدی کا چکر (vicious circle) ملاحظہ کیجیے: تعلیم کا مقصد ملازمت ہے (اسلامی روبیت کی رو سے غلط)۔ اچھی ملازمت کے لیے اچھی انگریزی ضروری ہے (اس کے لیے مغربی تہذیب کے ایجنٹوں نے خصوصی انتظامات کر رکھے ہیں مثلاً دفاتر میں انگریزی کا رواج [اس کے باوجود کہ اردو قومی زبان ہے اور آئین پاکستان کی رو سے اس کا نفاذ لازمی ہے] اعلیٰ ملازمتوں کے امتحان [PCS,CSS وغیرہ] کی زبان انگریزی ہے، فوج کی تعلیمی وتربیتی زبان انگریزی ہے...... وغیرہ) اور انگریزی زبان میں مہارت کے لیے انگریزی ذریعہ تعلیم ضروری ہے (ایک اور مغالطہ!) اور تعلیم عام کرنے کے لیے گلی گلی سکول کھلنے ضروری ہیں جن میں انگریزی ذریعہ تعلیم ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ مغربی تہذیب کے علم برداروں نے پاکستانی نظام تعلیم کو اپنے رنگ میں رنگنے کے لیے انگریزی زبان کی بالادستی کو ذریعہ بنایا ہے کیونکہ زبان ہی تہذیبی ابلاغ کا بنیادی ذریعہ ہوتی ہے اور اس کے لیے انہوں نے مکمل مصنوعی ماحول تخلیق کر رکھا ہے جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔ ورنہ انگریزوں کے آنے سے پہلے برصغیر کی سرکاری زبان فارسی تھی اور لوگ (دینی) مدارس میں فارسی اور فارسی کے ذریعے دیگر علوم پڑھ کر سرکاری ملازمت حاصل کرتے تھے (ہندو بھی اس غرض سے علماء سے فارسی زبان

اور دیگر علوم سیکھتے تھے)۔ پھر انگریزوں نے آ کر وہ نظام ختم کر دیا اور سرکاری ملازمت کے لیے انگریزی کی شرط رکھ دی۔ اس وقت یہ محاورہ وجود میں آیا کہ ''پڑھیں فارسی بیچیں تیل'' کیونکہ فارسی عربی پڑھنے سے ملازمت تو ملے گی نہیں۔ انگریزوں نے جو حال فارسی کا کیا تھا وہی حال اب ہمارے غلام حکمرانوں نے آئندہ نسلوں کو ذہنی غلام رکھنے کے لیے اسلامی جمہوریہ پاکستان میں قومی زبان اردو کا کر دیا ہے اور یہ فضا تخلیق کر دی ہے کہ اردو حقیر زبان ہے، اردو میڈیم سکول تو ماٹھے اسکول ہوتے ہیں، صرف اردو جاننے والے کو تو نوکری نہیں ملتی۔ ان سارے کاموں کے لیے انگریزی چاہیے انگریزی، انگریزی اور صرف انگریزی۔

آکسفورڈ کی کتابیں

جب تعلیمی نظام کے ذریعے ''مسلمان' 'اور ''پاکستانی'' بنانا ہمارے تعلیمی بزرجمہروں کے پیش نظر ہے ہی نہیں بلکہ ''کالے انگریز'' بنانا پیش نظر ہے جیسا کہ لارڈ میکالے نے ان کے لیے پلان کیا تھا، تو اس کے لیے یہی مناسب ہے کہ مسلمان پاکستانی طلبہ کے لیے کتابیں لکھنے والے غیر مسلم ہوں اور غیر پاکستانی ہوں لہٰذا ''آکسفورڈ کی کتابیں معیاری ہوتی ہیں''، ''ان کا گیٹ اپ بھی اچھا ہوتا ہے اور مواد کی پریزینٹیشن بھی''۔ رہی اردو میں لکھی گئی پاکستانی مصنفین کی کتابیں تو ''ان کا کوئی معیار ہی نہیں ہوتا''، ''کیا کریں صاحب! اردو کی کتابیں لگوائیں تو سکول میں ایڈمشن ہی کوئی خاص نہیں ہوتا''، ''کیا کریں آخر اسکول بھی تو چلانا ہے، روٹی بھی تو کھانی ہے''۔

جان میکڈونلڈ، سینٹ انتھونی، سیکرڈ ہارٹ......

یہ ان انگلش میڈیم سکولوں کے نام ہیں جو پاکستان میں گلی گلی کھلے ہوئے ہیں۔ غالباً نام رکھنے والوں کو پتہ ہی نہیں کہ ان ناموں کی کیا معنویت ہے؟ اور یہ کون لوگ تھے؟

گرامر سکول، پبلک سکول

یہ وہ اسکول ہیں جو مغربی معاشرے میں ان کی تعلیمی تاریخ کے مختلف مراحل میں وجود میں آئے جس کے اپنے اسباب تھے۔ یہاں صرف ان ناموں کی نقل ماری جاتی ہے تاکہ ایک اچھے انگلش میڈیم اسکول کا تاثر دیا جاسکے ورنہ ان کالے انگریزوں کی غالب اکثریت کو یہ معلوم ہی نہیں کہ ایک ''پبلک اسکول'' اور ایک ''گرامر اسکول'' ایک عام اسکول سے کیسے مختلف ہوتا ہے؟

پینٹ بشرٹ، نکٹائی، وی کی پٹی

یہ مسلم پاکستانی طلبہ و طالبات کا لباس ہے اور اسکول والے اپنے نظم و ضبط کی خاطر اس کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ جو بچے متعین یونیفارم میں نہ ہوں انہیں جرمانہ کیا جاتا ہے اور اسکول میں گھسنے نہیں دیا جاتا۔ مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں اور پاکستانیوں کو بچپن سے مغربی معاشرت اختیار کرنے کا پابند کیا جائے تاکہ وہ ساری زندگی اس پر عامل رہیں۔ گلے میں وی کی پٹی لٹکانے کی پابندی کا مطلب یہ ہے کہ اے بچی! تم نے ساری زندگی سرننگا رکھنا ہے، دوپٹہ لٹکانے کی چیز ہے، سر ڈھانپنے کی نہیں۔ جو اسکول شلوار قمیص اور پاکستانی لباس کو یونیفارم بنائیں وہ تو ماٹھے اور دقیانوسی اسکول ہوتے ہیں۔ عمدہ اور ماڈرن اسکول کے لیے ضروری ہے کہ یونیفارم مغربی لباس پر مشتمل ہو۔

او اور اے لیول

صاحب! بین الاقوامی ڈگری چاہیے، پاکستان کی ماٹھی ڈگری کو کون پوچھتا ہے؟ لہٰذا میٹرک کی ضرورت نہیں۔ وہ تو غریبوں اور عام طلبہ کے لیے ہے۔ مہربان حکومت نے میٹرک انگلش میڈیم کی اجازت دے رکھی ہے لیکن وہ بھی قابل قبول نہیں؟ اس کے لیے او لیول اور اے لیول ضروری ہے۔ اس کے لیے غیر ملکی اداروں کا نصاب پڑھنا

اور پڑھانا پڑے گا، پروا نہیں۔ فیسوں کی صورت میں قیمتی زرمبادلہ بیرون ملک جائے گا پروا نہیں، مغربی علوم اور ذریعہ تعلیم کے ذریعے مغربی تہذیب ہمارے بچوں کے دل ودماغ میں گھسے گی، پروا نہیں۔ پروا آخر کس چیز کی ہے؟ توقع ہے کہ ملازمت اچھی ملے گی۔ جی صاحب! دنیا سنوار یے، آخرت کس نے دیکھی ہے؟

غیر ملکی یونیورسٹیوں سے الحاق

غیر ملکی یونیورسٹیوں کو اجازت ہے کہ اپنی شاخیں پاکستان میں کھولیں اور جو چاہیں پڑھائیں۔ پاکستانی یونیورسٹیوں کو عام اجازت ہے کہ غیر ملکی یونیورسٹیوں کا نصاب اپنے ہاں پڑھائیں یا اپنے طلبہ کو وہاں بھجوائیں اور وہاں کی ڈگری دلوائیں۔ جب آپ کو اپنے عقائد، اپنی تہذیب اور اپنی پہچان کی فکر ہی نہیں تو آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔

مشنری سکول

ایک مسلمان معاشرے اور اسلامی ریاست میں غیر مسلم اقلیتوں کو اپنے مذہبی و تعلیمی ادارے قائم کرنے کی اجازت ہوتی ہے تاکہ وہ اپنے عقائد کے مطابق اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کر سکیں لیکن اس امر کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ان تعلیمی اداروں میں مسلمان بچے تعلیم وتربیت حاصل کریں۔ لیکن ہمارے ہاں کے مسلمان بڑے فخر اور خوشی سے اپنے بچے عیسائی مشنوں کے چرچوں میں قائم کیتھڈرل سکولوں میں بھجواتے ہیں اور اس پر نہ مملکت خداداد اسلامی جمہوریہ پاکستان کے حکمرانوں کو شرم آتی ہے اور نہ مسلمانوں کو غیرت!

تصویر

مغربی تہذیب کا مزاج یہ ہے کہ اس کے ہاں داخل کی بجائے خارج اور Content کی بجائے Form پر زور ہوتا ہے۔ یہ چیز اس کی جمالیات، معاشرت، ثقافت، فلسفہ غرض ہر چیز سے ظاہر ہے۔ تعلیم میں اس کا اظہار تصویر کے کثرت استعمال سے ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں تعلیم چونکہ مغرب کا چربہ ہے اس لیے پہلی جماعت کے قاعدے سے لے کر اوپر تک ہر جگہ تصویر کا راج ہے لیکن کسی مسلمان

خصوصاً مسلمان ماہر تعلیم کے کان پر اس حوالے سے جوں بھی نہیں رینگتی حالانکہ مغربی تہذیب کے برعکس اسلام کا تہذیبی مزاج خارج کے بجائے داخل اور Form کی بجائے Content پر زور دیتا ہے۔

پاکستانی وزیر تعلیم کا تقرر امریکہ کرتا ہے

یہ بات تو پہلے بھی معروف تھی کہ پاکستان (اور دیگر اسلامی ممالک) کے وزیر خارجہ اور وزیر مالیات کا تقرر یا تو خود امریکہ کرتا ہے یا کم از کم اس کی منظوری امریکہ دیتا ہے لیکن 9/11 کے بعد تازہ صورت حال یہ ہے کہ امریکہ چونکہ مسلمانوں کے دل و دماغ بدلنے کا کام ایک نئے عزم اور نئے جوش وخروش سے کرنا چاہتا ہے اس لیے پاکستان میں جنرل پرویز مشرف کی فوجی حکومت میں وزیر تعلیم کا تقرر بھی امریکہ کی مرضی سے ہوتا ہے۔ پہلے امریکی قیادت نے ایک 'Wonderful Lady' (زبیدہ جلال) اس کے لیے چنی اور جب اس کی افادیت کچھ کم ہوگئی تو ایک مقابلتاً زیادہ مضبوط، زیادہ سیکولر اور امریکی ایجنسیوں کے نزدیک زیادہ قابل اعتماد شخص (جنرل جاوید اشرف قاضی) اس عہدے پر متعین کیا گیا۔

تعلیم میں این جی اوز کا کردار

یہ تصور بھی مغرب کا ہے اور بظاہر سادہ اور بے ضرر کہ تعلیم اور معاشرتی بہبود کے دیگر کاموں کے لیے عوامی تنظیموں کو متحرک کیا جائے لیکن مسلمان ممالک میں یہ غیر حکومتی تنظیمیں (Non Governmental Organizations) مغربی فکر و تہذیب بلکہ مغربی حکومتوں کے ایجنڈے کے نفاذ کا اہم ذریعہ بن گئی ہیں۔ اس کا طریق واردات یہ ہے کہ مغربی ممالک اور ان کی این جی اوز حکومتی اشارے پر مسلمان ممالک کی این جی اوز کی مالی مدد کرتی ہیں، ان کے افراد کی تربیت کرتی ہیں، انہیں مغربی ممالک کے دورے کرواتی ہیں اور اس طرح ان کی نظریاتی سمت پر اثر انداز ہو کر انہیں اپنے ایجنڈے کے مطابق استعمال کرتی ہیں۔ یہ تنظیمیں عام طور پر تعلیمی اصلاح، بنیادی انسانی حقوق

کے تحفظ، بہتر صحت، سیاسی اداروں کی کارکردگی بڑھانے اور سماجی ترقی وغیرہ جیسے بظاہر پرکشش اور دلفریب نعرے لگا کر کام کرتی ہیں جبکہ مغرب کا اصل مقصد ان کی مدد سے یہ ہوتا ہے کہ اسلام، اسلامی تعلیم، اسلامی اقدار، اسلامی قوتوں اور محبّ وطن حلقوں کے خلاف سرگرمیوں کو منظم کیا جائے اور غیر حکومتی سطح پر اپنے ایجنڈے کو متعارف کرایا اور آگے بڑھایا جائے۔ بسا اوقات معاشرتی اداروں کے علاوہ حکومتوں اور حکومتی پالیسیوں پر اثر انداز ہونے کے لیے بھی ان این جی اوز کو استعمال کیا جاتا ہے۔ پاکستان میں آغا خان فاؤنڈیشن اور کئی دیگر این جی اوز تعلیم میں مغربی کاز کو آگے بڑھانے کے لیے اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔ آغا خان فاؤنڈیشن کا ایک ذیلی ادارہ ''این جی او ریسورس سنٹر'' این جی اوز کو متحرک، فعال اور منظم کرنے کے لیے کوشاں ہے جبکہ یہ قوتیں این جی اوز کی رجسٹریشن اور ان کو سہولتوں کی فراہمی وغیرہ کو کنٹرول کرنے، اسلامی این جی اوز کا راستہ روکنے اور آزاد خیال این جی اوز کی حمایت کرنے کے لیے بھی حکومتی تعاون سے پی سی پی (Pakistan Center for Philonthropy) کے نام سے ایک ادارہ بنانے میں کامیاب ہوگئی ہیں۔ یوں یہ این جی اوز فعال طریقے سے پرائیویٹ (اور پبلک) سیکٹر میں مغربی اور امریکی ایجنڈے کو آگے بڑھا رہی ہیں۔

تربیت۔ مغربی فکر و تہذیب کے مطابق

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں تعلیم تو ہے لیکن تربیت کا فقدان ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں تربیت کا موثر نظام موجود ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اسلامی نہیں ہے۔ جب آپ بچے کو کہتے ہیں کہ وہ لازماً نکٹائی اور پینٹ شرٹ پہن کر آئے، جب آپ مسلمان بچی کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ وی کی پٹی کندھوں پہ لٹکائے اور سر نہ ڈھانپے، جب آپ اسے غیر مسلموں اور غیر ملکیوں کی لکھی ہوئی کتابیں پڑھاتے ہیں اور یوں سارا نصاب مغربی فکر و فلسفے کے مطابق مدون کیا ہوا پڑھاتے ہیں، جب آپ استاد کو مربی اور معلم اخلاق ماننے کے بجائے اسے ایک تنخواہ دار مزدور بنا دیتے ہیں، تو اسلامی

تربیت کیسے ہو سکتی ہے؟ آپ کا سارا تعلیمی ڈھانچہ بچے کو یکسو مسلمان بنانا ہی نہیں چاہتا بلکہ مغرب کا غلام بنانا چاہتا ہے تو وہ یکسو مسلم شخصیت کا حامل کیسے بن جائے؟

تربیت میں تصوف کا کردار

مسلم روایت میں مدرسہ تعلیم کا ادارہ تھا اور خانقاہ تربیت کا، تصوف کے اس تربیتی ادارے نے ماضی میں بڑی مفید خدمات انجام دیں لیکن دوسرے شعبوں کی طرح اس میں بھی بتدریج زوال آ گیا اور غیر اسلامی عناصر اس میں دخیل ہو گئے۔ آج ضرورت اس امر کی تھی کہ تصوف کی روایتی دانش کو غیر اسلامی افکار کی آمیزش سے پاک کر کے تعلیمی اداروں میں بچوں کی تربیت کے لیے اسے استعمال کیا جاتا۔ اس کے برعکس مغربی فکر و تہذیب سے متاثر افراد اور حلقے پہلے تو تربیت و تزکیے کو تصوف کے مساوی گردانتے ہیں پھر صوفیاء کے افکار میں سے اپنی مرضی کے مندرجہ ذیل تصورات کو بگاڑ کر اور بڑھا چڑھا کر پیش کرتے اور میڈیا کے ذریعے انہیں عوامی سطح پر پاپولر کرنے کی کوشش کرتے ہیں:

- صوفیا وحدت ادیان اور وحدت انسانیت کے علمبردار تھے۔
- مغربی، ہندی، ایرانی اور اسلامی تصوف دراصل ایک ہی چیز ہے۔
- تصوف دراصل سریت ہے یعنی یہ پراسرار علم ہے (اسی لیے انگریزی میں اس کا ترجمہ Mysticism یعنی سرّیت کیا جاتا ہے) حالانکہ یہ محض بہتان ہے۔
- عملیات کرنے والے (جن میں بعض غیر مسلم بھی ہوتے ہیں)، تعویذ اور دم کرنے والے، خالص دنیادار اور بے دین وراثتی گدی نشین جن کا معاشرتی اور سیاسی اثر ورسوخ بے پناہ ہے۔ حال و مستی کی کیفیت طاری کرنے کے لیے منشیات کا استعمال (بھنگ اور چرس)، رقص و سرود (قوالیاں اور دھمال)، گندگی اور بے حیائی (ننگ دھڑنگ اور گندے ملنگ اور مجذوب) اور فحاشی (عرس کے نام پر میلے ٹھیلے جن میں موت کا کنواں اور اس سے ملتے جلتے پروگرام جن میں تیز موسیقی اور فحش رقص ہوتے ہیں)۔ یہ سب کچھ تصوف کے نام پر ہوتا ہے جو مسلم روایت میں تزکیہ و تربیت کا سب سے بڑا ادارہ ہے۔

دینی تعلیم

تعلیمی ثنویت کا گناہ

دینی تعلیم الگ ہو اور دنیاوی تعلیم الگ، یہ بھی مغربی تہذیب کے اثرات کا نتیجہ ہے اور سو فیصد غیر اسلامی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس کے علم بردار علماء کرام ہیں لیکن انہیں بھی احساس نہیں کہ یہ حرکت خالصتاً خلاف اسلام ہے۔ جب انگریزوں نے برصغیر سے مسلمانوں کی حکومت ختم کی تو ان کا نظام تعلیم بھی ختم کر دیا اور اپنے نظام تعلیم کا اجراء کیا۔ علماء نے اس وقت دفاعی حکمت عملی اختیار کرتے ہوئے اور اسلامی علوم و معارف، مساجد و مدارس اور مسلم معاشرت کو تباہی سے بچانے کے لیے خالی پیٹ، مٹی کے حجروں میں اور درختوں کے نیچے بیٹھ کر مسلمان بچوں کو قرآن و حدیث پڑھانا شروع کیا۔ اُس وقت وہ ایک عظیم الشان کام تھا لیکن اب تقریباً ڈیڑھ صدی گزر جانے کے بعد اور پاکستان قائم ہو جانے کے بعد اس روش پر قائم رہنا نا قابل فہم و ادراک ہے۔ مغرب اور اس کے تربیت یافتہ حکمران اور بیورو کریٹ تو یہ چاہتے ہی ہیں لیکن بدقسمتی یہ کہ ہمارے علماء کرام بھی ثنویت کے اس غیر اسلامی نظام کو ختم نہیں کرنا چاہتے۔ چنانچہ یہ ''سیکولرزم'' دن بدن مستحکم ہو رہا ہے اور پاکستانی معاشرے میں مسٹر اور مولوی کی تقسیم گہری ہوتی جا رہی ہے اور معاشرے کے ہر شعبے میں مغربی تہذیب کے بداثرات بڑھتے جا رہے ہیں۔

دینی مدارس اور فرقہ واریت

ہمارے دینی مدارس جو فرقہ واریت کا گڑھ ہیں تو یہ بھی بالواسطہ مغربی تہذیب کے زیر اثر ہمارے حکمرانوں اور نوکر شاہی کی کوششوں کا ثمر ہے۔ حکومت نے ہر مسلک کا دینی تعلیم کا الگ وفاق (بورڈ) منظور کیا اور اسے اجرائے امتحانات و عطائے اسناد کا اختیار دیا، کیا وہ ان کا ایک وفاق نہ بنا سکتی تھی؟ کیا وہ ان کا ایک نصاب نہ بنا سکتی تھی؟

مدارس اور مساجد کی رجسٹریشن حکومت کرتی ہے۔ کیا وہ یہ نہیں کر سکتی کہ مدارس و مساجد کے ناموں سے فرقہ واریت کا اظہار نہ ہو اور مساجد اللہ کا گھر ہوں جہاں بستی کے سب مسلمان مل کر نماز ادا کریں، نہ کہ فرقہ واریت کے گڑھ۔ پاکستانی حکمران یہ سب کچھ کر سکتے تھے اور آج بھی کر سکتے ہیں لیکن ایسا کرنا ان کے مفاد میں نہیں۔ ان کے مفاد میں یہ ہے کہ علماء میں مسلک پرستی بڑھے اور وہ باہم منقسم اور منتشر رہیں بلکہ آپس میں لڑتے رہیں تاکہ وہ آرام و سکون سے حکومت کرتے رہیں اور مغربی آقاؤں کی خواہشات پوری کرتے رہیں۔ ہمارے علماء کرام کی فراست نہ جانے کہاں سوئی ہوئی ہے کہ انہیں یہ سب کچھ نظر نہیں آتا؟

دینی مدارس اور دہشت گردی

دینی مدارس بیچارے دہشت گرد پیدا نہیں کرتے اور نہ کسی کو فوجی ٹریننگ دیتے ہیں۔ ان کا اصل "قصور" یہ ہے کہ وہ مغرب کے آگے جھکنے کو تیار نہیں، مغرب کو جس طرح کی شخصیت چاہیے وہ ویسی شخصیت اپنے مدارس میں ڈھالنے کو تیار نہیں۔ ظاہر ہے یہ ایک ایسا 'جرم' ہے جو ناقابل معافی ہے۔ طالبان کو اسی کی سزا ملی، پاکستان کے دینی مدارس کے خلاف سارے پروپیگنڈے کا مقصد بھی یہی ہے کہ نصاب بدلو، یہ بدلو، وہ بدلو غرض بدل کر ہماری مرضی کے ہو جاؤ ورنہ تم دہشت گرد ہو اور ہم تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔

عقائد و اقدار

مادہ پرستی اور دنیا پرستی

- معیارِ زندگی کی دوڑ

مسلم روایت میں چونکہ ہر فرد کا ہدف آخرت کی کامیابی تھی لہٰذا دنیا میں ہر قیمت پر آسائشوں اور تعیّشات کے حصول کی دوڑ نہ تھی بلکہ مسابقت نیکی کے کاموں میں تھی۔

مغربی تہذیب میں چونکہ ہر فرد کا ہدف محض دنیا کی بہتری ہے، اس لیے مغربی اثرات کے تحت مسلم معاشرے بھی معیار زندگی کی دوڑ میں شامل ہو گئے ہیں۔ اب ہر آدمی ہر وقت زیادہ سے زیادہ کمانے کی فکر میں لگا رہتا ہے تاکہ اس کا معیار زندگی بلند ہو سکے۔ غریب طبقہ چھلانگ لگا کر متوسط طبقے میں شامل ہونا چاہتا ہے، متوسط طبقہ اعلیٰ متوسط طبقے میں، اعلیٰ متوسط طبقہ امیر طبقے میں اور طبقۂ امرا ہر وقت امیر تر بننے کے لیے کوشاں رہتا ہے اور وہ بھی ہر قیمت پر، خواہ جائز ہو یا ناجائز۔

راتوں رات امیر بننے کی خواہش

دنیا پرستی اور مادہ پرستی کا ذہن انسان کو جلد سے جلد امیر بن جانے کی ترغیب دیتا ہے اور وہ بھی ہر قیمت پر۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ راتوں رات امیر بننے کے لیے مسلمان منشیات فروشی، چوری، ڈاکے، قتل و غارت گری، دھوکہ، فریب غرض کسی چیز سے بھی نہیں کتراتے، بس کسی نہ کسی طرح دولت ہاتھ آنی چاہیے تاکہ دنیا کی آسائشیں خریدی جاسکیں۔

عزت کا معیار دولت

مسلم روایت میں عزت کا معیار تقویٰ تھا، مغرب کی پیروی میں معاصر مسلم معاشرے نے عزت کا معیار دولت کو بنا لیا ہے۔ اب معزز وہ ہے جس کے پاس کار، کوٹھی، بنک بیلنس اور کارخانے ہیں۔ غریب آدمی کی کوئی عزت نہیں خواہ وہ کتنا بھی متقی اور پرہیز گار ہو۔

حرص و ہوس کی حکمرانی

آج کا مسلمان مغرب کی پیروی میں حرص و ہوس کا شکار ہو چکا ہے جبکہ مسلم روایت قناعت اور توکل کا درس دیتی تھی۔ مسلم روایت میں دنیا کی محبت گناہ کا سرچشمہ تھی اور ہر آدمی کی نظر آخرت کی کامیابی پر رہتی تھی۔ اب دنیا ہی منزل ہے اور ہر قیمت

پر دنیا میں کامیابی اور آسائشوں کا حصول ہی مقصدِ زندگی ہے، خواہ اس کے لیے ہر اخلاق اور ہر قدر کی نفی ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

سیکولرزم

''نماز میرا فرض اور چوری میرا پیشہ ہے''

یہ جملہ ایک پاکستانی فلم کا ہے۔ لوگ نماز پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں لیکن ساتھ ہی عملی زندگی میں اسلامی احکام پر دھڑلے سے عمل نہیں کرتے اور اس پر ان کا ضمیر ذرا بھی ملامت نہیں کرتا۔ یوں لوگوں نے اپنی زندگی کو دین و دنیا کے دو الگ الگ خانوں میں بانٹ رکھا ہے۔ کچھ مذہبی مراسم ادا کر دیے، بس یہ کافی ہے۔ ساری زندگی میں مسلمان ہونے کا تصور اب دھندلا گیا ہے، اس کا ایک بڑا سبب مغربی سیکولرزم سے متاثر ہونا بھی ہے جہاں یہ ثنویت غالب اور سکہ رائج الوقت ہے۔

مسٹر اور مولوی کی تقسیم

مغربی سیکولرزم کے اثرات سے مسلم معاشرہ مسٹر اور مولوی میں تقسیم ہو گیا ہے یعنی کچھ لوگ مذہبی ہیں اور کچھ غیر مذہبی یا دنیا دار۔ اس کا بڑا مظہر ہمارا تعلیمی نظام ہے جہاں دینی تعلیم کے لیے مدرسے ہیں جن میں دنیاوی تعلیم کا گزر نہیں اور جدید تعلیم کے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دینی تعلیم و تربیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس نظام تعلیم نے معاشرے کو بھی ثنویت میں مبتلا کر دیا ہے اور اسے مذہبی و غیر مذہبی افراد میں بانٹ دیا ہے۔ اجتماعی سطح پر بھی کچھ اداروں اور جماعتوں کو اسلامی جماعتیں اور اسلامی ادارے کہا اور سمجھا جاتا ہے اور باقی کو غیر مذہبی اور سیکولر۔

دینی تصورات کا مسخ

- دین کو مذہب (Religion) کہنا اور سمجھنا
- دین کو مذہب سمجھ کے تہذیب، معاشرے اور سوشل سائنسز کا ایک جزو سمجھنا

- دین کو محض چند رسوم و رواج کا مجموعہ سمجھنا
- دین کو محض نماز روزے جیسے چند انفرادی اور مذہبی امور تک محدود سمجھنا اور اجتماعی زندگی (تجارت، سیاست، معاشرت، معیشت وغیرہ) اپنی مرضی سے بسر کرنا
- عقل و حواس اور تجربہ و مشاہدہ (یعنی سائنس اور سائنسی رویے) کو حق و باطل کا معیار سمجھنا
- جو اسلامی حکم سمجھ میں نہ آئے یا بظاہر عقل اور مغربی فکر کے خلاف ہو، اسے توہم پرستی، قدامت پسندی اور ضعیف الاعتقادی کہہ کر رد کر دینا
- دینی احکام کی حکمتوں کی تفہیم کو ان پر عمل سے مشروط کرنا یعنی عقل کو وحی پر ترجیح دینا
- دین کو دنیوی ترقی کا ذریعہ نہ سمجھنا
- رسم و رواج پر عمل میں ذوق و شوق کو دینی ترقی کا ذریعہ سمجھنا
- دین کو محض نظام زندگی سمجھنا
- دین کو ایک تحریک قرار دینا
- دین کو ایک آئیڈیالوجی سمجھنا
- اسلام کو جدید تناظر میں سمجھنے کی بجائے اسلام کی تجدید کی کوشش کرنا
- مغربی نظریات کو عین اسلامی قرار دینا جیسے نظریہ ارتقاء اور نظریہ لاشعور وغیرہ
- مغربی اصطلاحات کا اسلامی تصورات پر انطباق کرنا جیسے ''اسلامی جمہوریت''
- اہلیت نہ رکھنے کے باوجود دینی امور میں فیصلے کرنا
- دین کی ہواخیزی کے لیے علماء پر تنقید کرنا، ان کی تحقیر کرنا اور مذاق اڑانا
- یہ سمجھنا کہ بعض اسلامی احکام موجودہ زمانے میں قابل عمل نہیں جیسے نفاذ حدود اور بلاسود معیشت وغیرہ
- سنت پر مبنی بعض احکام کے بارے میں یہ رائے رکھنا کہ وہ صرف چودہ صدی قبل

کے عرب معاشرے کے لیے موزوں تھے

- اہل مغرب کو مہذب اور مسلمانوں کو غیر مہذب سمجھنا اور کہنا
- یہ کہنا کہ اسلامی اخلاق تو مغرب نے اپنا لیے ہیں
- موجودہ سائنسی حقائق کو قرآن سے ثابت کرنا یعنی قرآن کو سائنس کی ایک کتاب سمجھنا
- دین میں تحریف کر کے یہ دعویٰ کرنا کہ ہم اصلی دین بحال کرنے کی کوشش کر رہے ہیں
- یہ سمجھنا اور کہنا کہ اسلام انتہا پسندی اور دہشت گردی سکھاتا ہے
- یہ سمجھنا کہ اخروی نجات کے لیے اسلام ناگزیر نہیں بلکہ دوسرے ادیان پر عمل کر کے بھی حصول جنت ممکن ہے
- یہ سمجھنا کہ دنیا میں جو غیر مسلم مفید اور رفاہی کام کرتے ہیں (مثلاً ہسپتال قائم کرنا یا سکول کھولنا وغیرہ) انہیں آخرت میں ان کا اجر ملنا چاہیے

علم و تحقیق

- یہ سمجھنا کہ علم و تحقیق میں مغرب کی پیروی کرنے میں کیا ہرج ہے جب کہ وہ اس میدان میں ہم سے آگے ہے۔
- علم و تحقیق میں مغرب کی پیروی تک محدود رہنا
- علم و تحقیق کی بنیاد عقل، حواس، مشاہدے اور تجربے کو قرار دینا (یوں بالواسطہ طور پر وحی کی حتمی حیثیت سے انکار کرنا۔)
- اسلامی علوم میں مستشرقین کی تحقیق کو حرف آخر قرار دینا
- اسلامی علوم اور عمرانی علوم (جیسے قانون، معاشیات، سیاسیات، سماجیات وغیرہ) میں اعلیٰ تعلیم و تحقیق کے لیے مغربی یونیورسٹیوں کا رخ کرنا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی بھی قوم اور تہذیب کی ترقی میں علم و تحقیق بنیادی

کردار ادا کرتے ہیں اور اس میں بھی شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ مغرب اس وقت علم و تحقیق میں ہم سے بہت آگے ہے اور ہم اس میدان میں بہت پیچھے ہیں لیکن جیسا کہ اس کتاب کے پہلے باب میں بیان کیا گیا ہے کہ اس کا حل یہ ہے کہ ہم اپنے ورلڈ ویو اور اپنے تصور علم کے مطابق علم و تحقیق میں ترقی کریں نہ کہ مغربی علم و تحقیق کی پیروی شروع کر دیں۔

علم و تحقیق میں ترقی کا انحصار کسی بھی قوم اور تہذیب کی تخلیقی اور اخلاقی قوت پر ہوتا ہے۔ کسی دوسری قوم اور تہذیب کی پیروی میں یہ دونوں قوتیں مرجھا جاتی ہیں اور یہ صرف آزادی، حریت فکر اور اپنے نظریۂ حیات سے وابستگی کے نتیجے میں پروان چڑھتی ہیں۔ اور اگر اس دوسری تہذیب کا ورلڈ ویو اور تصور علم اس مقلد قوم سے مختلف ہو تو مقلد قوم ترقی کرنے کی بجائے مزید قعر ذلت میں دھنستی چلی جاتی ہے کیونکہ اس سے اس کی قومی شناخت مجروح ہوتی ہے اور فرد کی شخصیت فکر و عمل کی یکسوئی سے محروم ہو کر کمزور و مضمحل ہو جاتی ہے۔

اس فارمولے سے سائنس و ٹیکنالوجی بھی مستثنیٰ نہیں لیکن عمرانی علوم تو اس کا بنیادی ہدف ہیں کیونکہ عمرانی علوم ہی وہ علوم ہیں جو فرد اور معاشرے کی شخصیت کی تکوین میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں اور اسلام اور اسلامی تہذیب کے حوالے سے تو یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اہل مغرب کا مطالعۂ اسلام سطحی اور اپنے مسلم دشمن ایجنڈے اور خصوصی اغراض پر مبنی ہے لہٰذا عمرانی علوم میں عموماً اور اسلامی علوم میں خصوصاً مغرب کی پیروی کرنا قومی اور تہذیبی خودکشی کے برابر ہے۔

سائنس و ٹیکنالوجی

- یہ سمجھنا کہ ترقی کا انحصار سائنس و ٹیکنالوجی پر ہے۔
- قوموں کے عروج و زوال کا سبب سائنس و ٹیکنالوجی ہے۔
- مسلمان اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتے جب تک وہ سائنس و ٹیکنالوجی میں ترقی

نہ کریں اور چونکہ اس وقت سائنس وٹیکنالوجی کی قیادت مغرب کے ہاتھ میں ہے لہٰذا اس میدان میں مغرب کی پیروی کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

مندرجہ بالا ایک ہی موضوع کے مختلف عناوین ہیں جو ایک ہی سپرٹ کے غماز ہیں اور ان میں جو بات کہی گئی ہے وہ سرسری نظر میں صحیح لگتی ہے لیکن درحقیقت سطحی اور غیر حقیقی ہے۔ ہم اس کتاب کے پہلے باب میں ذکر کر چکے ہیں کہ ترقی کا بنیادی آلہ 'انسان' ہے اور انسان کی ترقی کا بنیادی طریقہ یہ ہے کہ وہ کسی نظریۂ حیات سے محکم طور پر وابستہ ہو جائے۔ اس سے اس کے اندر وہ صفات ابھر آئیں گی (جیسے محنت، نظم و ضبط، پابندیٔ قانون، ایثار و قربانی وغیرہ) جو ترقی کے لیے ضروری ہیں۔ پھر تعلیم، تربیت، تحقیق کے ذریعے سیاسی و معاشی استحکام حاصل ہوگا تو اس کے بعد ہی سائنس و ٹیکنالوجی میں پیش رفت ہو سکے گی۔ درحقیت سائنس وٹیکنالوجی میں پیش رفت کا ذریعہ علمی اور تحقیقی ترقی اور تخلیقی قوت ہے جس کے لیے انسان کی ترقی اور کثیر سرمایہ درکار ہے۔ لہٰذا مذکورہ بالا منہج سے گزرے بغیر محض کسی ترقی یافتہ قوم اور تہذیب کی سائنسی ترقی یا معاشرت کی نقل کرنا یا اس سے استفادہ کرنا ہرگز ہرگز ترقی پر منتج نہیں ہو سکتا بلکہ محض ذہنی غلامی اور اس سائنس وٹیکنالوجی کا صارف بننے کے مترادف ہے۔

ہماری اس دلیل کے باوزن ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ کوئی اسلامی ملک آج تک مغرب کی پیروی کر کے ترقی نہیں کر سکا۔ ترکی نے مغرب کی پیروی ۱۹۲۰ء کی دہائی میں شروع کی تھی لیکن آج بھی اس کی معاشی اور معاشرتی حالت پتلی ہے یہاں تک کہ نہ کوئی مسلم ملک اس کو ماڈل سمجھتا ہے اور نہ یورپی یونین اسے گھاس ڈالنے پر تیار ہے۔ مسلمان ممالک اگر ترقی کرنا چاہتے ہیں تو اس کا ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ وہ اپنے نظریۂ حیات سے محکم طور پر وابستہ ہو جائیں اور اس کے تقاضوں کو پورا کریں۔ اس طرح ان کے باطن میں موجود انسانی ترقی کے جوہر کھلنا شروع ہو جائیں گے اور وہ تعلیم وتربیت اور تحقیق میں پیش رفت کے ذریعے سیاسی اور معاشی استحکام سے بہرہ ور

ہو کر طاقت ور ہو جائیں گے۔ اسی انسان ترقی کی بنا پر مسلمانوں نے صدر اسلام میں اس وقت کی دو سپر پاورز (روم اور ایران) کو شکست دے کر ان کی جگہ لے لی تھی اور اسی نسخے پر عمل کر کے وہ آج بھی عظمت رفتہ کو آواز دے سکتے ہیں۔

یہ بھی یاد رہے کہ یہ انسانی ترقی مسلمان صرف اپنے نظریۂ حیات سے وابستہ ہو کر حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر انہوں نے اس خیال سے انسانی ترقی کے لیے مغرب کے نظریۂ حیات کی پیروی شروع کر دی کہ انہوں نے اس پر عمل کر کے ترقی کی ہے، تو وہ ہرگز ہرگز ترقی نہ کر سکیں گے بلکہ نہ گھر کے رہیں گے نہ گھاٹ کے کیونکہ مغربی تہذیب کی اساس سیکولرزم اور ہیومنزم وغیرہ پر ہے جو بنیادی طور پر الحادی نظریات ہیں اور توحید، رسالت، اور آخرت کے انکار پر مبنی ہیں لہٰذا مسلمان جب ان مغربی نظریات پر عمل کی کوشش کرتا ہے تو چونکہ جن نظریات پر وہ پہلے سے یقین رکھتا ہے (یعنی خدا، رسول اور آخرت پر) وہ مغربی نظریات کے بالکل الٹ ہیں لہٰذا اس کی شخصیت جمع بین الضدین کی وجہ سے کشمکش کا شکار ہو کر ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے اور انتشار و اضمحلال کا شکار ہو جاتی ہے اور اس کے اندر وہ اخلاقی اور تخلیقی قوت پیدا ہی نہیں ہو سکتی جو دنیاوی ترقی کا بنیادی زینہ ہے۔

اخلاق

- اسلام کے اخلاق اہل مغرب نے اپنا لیے ہیں۔
- مسلمانوں کو اہل مغرب کے اخلاق اپنانے چاہئیں۔
- مغرب اس لیے بالاتر ہے کہ اس کے اخلاق ہم سے اچھے ہیں، وہ 'صالح' ہے اور مستحق غلبہ و خلافت ہے۔
- اہل مغرب مہذب اور مسلمان غیر مہذب ہیں
- مسلمان تو اہل مغرب کے تجارتی اخلاق (Commercial Ethics) جتنا اخلاق بھی نہیں رکھتے۔

مندرجہ بالا اوران سے ملتے جلتے تصورات مسلمانوں میں مغرب سے مرعوبیت کی وجہ سے پائے جاتے ہیں۔ہم نے اس کتاب میں اختصار کے ساتھ اور اپنی کتاب 'مسلم نشاۃ ثانیہ - اساس اور لائحہ عمل'' میں تفصیل کے ساتھ یہ نقطۂ نظر واضح کیا ہے کہ مغربی تہذیب کے عروج کی وجہ اس کی صالحیت اور مکارم اخلاق نہیں ہیں اور یہ کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ زمین میں قوموں کے عروج و زوال کے اسباب معروضی ہوتے ہیں اورسب کے لیے تقریباً یکساں اور یہ بنیادی طور پر تین ہیں: ۱۔ انسانی وسائل (جیسے محنت، نظم وضبط، پابندیٔ قانون، تنظیم اور ایثار ۲۔ نموئی وسائل (جیسے تعلیم، تربیت، تحقیق، میڈیا، سیاسی استحکام) اور ۳۔ مادی ذرائع (جیسے معاشی استحکام، حربی قوت اور سائنس وٹیکنالوجی میں پیش رفت وغیرہ) اور ان وسائل کے حصول کا بنیادی ذریعہ ہے ''اپنے' نظریہ حیات سے پختہ وابستگی''۔اب جو قوم اور معاشرہ بھی ان اصولوں پر عمل کرے گا وہ زمین میں غلبہ حاصل کرلے گا اور چھا جائے گا۔

ان وسائل کو اور خصوصاً اول الذکر کو شاید بنیادی اخلاق کہا جا سکے لیکن اس کے باوجود یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ مغربی تہذیب کے غلبے کا سبب اس کی اخلاقی برتری اور اخلاقی عظمت ہے۔ اہل مغرب کی ترقی اور مسلمانوں پر غلبے کے بڑے اسباب یہ ہیں کہ انہوں نے مسلمانوں سے مقابلہ کرنے اور انہیں زیر کرنے کے لیے ایک طرف احیائے علوم کی بنیاد رکھی تو دوسری طرف مسلمان ممالک کے خلاف سازشیں کر کے انہیں باہم لڑایا (جیسے عربوں کو ترکوں کے خلاف) اور کمزور کیا، پھر پورے یورپ نے باہم متحد ہو کر ان کو جنگ میں شکست دی، ان کے ملکوں پر قبضہ کیا، ان کے معاشی وسائل (نقدی کے علاوہ خام مال، قیمتی معدنیات، تیل اور گیس وغیرہ) کو لوٹا، ان سے اپنے ہاں سائنس وٹیکنالوجی کو ترقی دی، کارخانے چلائے اور تیار شدہ مال لے جا کر انہی مسلمان ممالک کی منڈیوں میں مہنگے داموں بیچا۔ان کے تعلیمی، قانونی اور سیاسی نظاموں کو ختم کیا اور اپنا نظام زندگی وہاں بالجبر نافذ کیا۔انہیں جاہل اور پسماندہ رکھا تا کہ وہ ذہنی اور

فکری طور پر ختم ہو جائیں اور مغربی فکر اور غلبے کو قبول کر لیں۔ ان سارے اقدامات کے لیے ہر ظلم و ستم روا رکھا، علماء اور حکمران طبقے کو تہ تیغ کیا، جیلوں میں ڈالا، اہل حرفت کے ہاتھ کٹوائے، ان کو بے روزگار کیا، یہ تو ماضی بعید کے قصے تھے ابھی پچھلے چند سالوں میں افغانستان، بوسنیا، عراق، فلسطین، کشمیر، چیچنیا میں جو کچھ زیادتی، ظلم و ستم اور لوٹ مار (عراقی تیل، افغانستان کی قیمتی معدنیات اور چیچنیا کا گیس و تیل) اہل مغرب نے کی اور کروائی اور آج بھی سب کچھ کر رہے ہیں، اور گوانتانا موبے، ابوغریب جیل، تورابورا اور بوسنیا (اجتماعی قتل اور اجتماعی آبروریزیوں سے نسل کشی) میں انسانیت کے خلاف جو قبیح ترین اور مکروہ ترین جرائم کیے گئے اور آج بھی کیے جا رہے ہیں (سعودی عرب، کویت، اور متحدہ عرب امارات کے تیل کے کنوؤں پر مغرب قابض ہے) پاکستان پر دباؤ ڈال کر اسے افغانستان کے خلاف لڑائی میں استعمال کیا اور اب بھی القاعدہ کے حوالے سے اس کے اعصاب پر سوار ہے اور اس کے ازلی دشمن بھارت کو اس پر لادے جا رہا ہے۔ پھر مغرب میں فحاشی، عریانی، شراب نوشی، زنا کی کثرت، حرامی بچوں کی تعداد میں اضافہ، میڈیا کے ذریعے ان سارے فواحش کو دنیا بھر میں پھیلانا، مسلمانوں سے نفرت، خود غرضی، استحصال وغیرہ کو بھی ذہن میں رکھیے۔ ان کی موجودگی میں یہ کہنا کہ مغرب مکارم اخلاق کی وجہ سے اور اپنی صالحیت کی وجہ سے بالادست ہے محض خود فریبی اور حالات و واقعات سے غلط استنباط ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مغرب کی بالادستی کی وجہ اس کی اخلاقی عظمت نہیں بلکہ اس کے اسباب دوسرے ہیں جن کی طرف ہم نے سطور بالا میں اشارہ کیا ہے اور ان کو ڈھیل اس لیے ملی ہوئی ہے کہ کوئی دوسری قوم اور تہذیب ابھی ایسی سامنے نہیں آئی جو بنیادی انسانی اوصاف میں ان سے بہتر اور برتر ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہے کہ اس نے ایک وقت موعود تک اس دنیا کا نظام چلانا ہے لہٰذا جب تک اہل مغرب سے بہتر لوگ دنیا کا انتظام سنبھالنے کے لیے آگے نہیں بڑھتے اس وقت تک اہل مغرب کا سکہ چلے

رہے گا تا آنکہ اہل مغرب کے فساد فی الارض اور ظلم وستم سے یہ دنیا رہنے کے قابل نہ رہے اور اللہ تعالیٰ کی مشیت کسی دوسری قوم/تہذیب کو ان کی جگہ لینے کے لیے سامنے لے آئے۔

عبادات

- نماز کے لیے بار بار دفتر/کاروبار سے اٹھ کر مسجد جانا تضیع اوقات ہے۔
- نماز سے کپڑے خراب ہوتے ہیں مثلاً پینٹ کی کریز۔ وضو کرتے وقت کوٹ اور ٹائی وغیرہ کو سنبھالنا مصیبت ہے۔ پینٹ کے پائنچے تو ٹخنوں سے نیچے ہی ہوتے ہیں، ان کو چھوٹا کرنے والا تو پینڈو ہی کہلائے گا۔
- گھر مسجد سے دور ہونا چاہیے تاکہ اذان کی آواز اور مولوی صاحب کے وعظ ہر وقت تنگ اور بیزار نہ کریں۔
- رمضان کے روزے اس لیے رکھنا کہ کچھ وزن کم ہو جائے اور معدہ بھی درست ہو جائے۔
- زکوۃ کو ٹیکس سمجھنا اور ٹیکس سمجھ کر مجبوری اور کراہت سے ادا کرنا۔
- مسلمان حکومتوں کا سو طرح کے ٹیکس لگانا لیکن زکوۃ وعشر کی وصولی کا موثر انتظام نہ کرنا۔
- حج اور عمرے پر خرچ کی جانے والی رقم غریبوں، یتیموں اور بیواؤں پر خرچ کرنی چاہیے۔
- قربانی کا کوئی فائدہ نہیں، یہ رقم غریبوں اور مسکینوں کو دے دینی چاہیے۔
- قربانی جانوروں پر ظلم ہے۔
- اہل حرم نے حاجیوں کی خدمت کو کاروبار اور جلب زر کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔

تزکیہ و تصوف

اسلامی اور غیر اسلامی تصوف ایک ہی چیز ہیں اور ان کے مقاصد، احوال اور مباحث وغیرہ (خدا کو پانے کے لیے ریاضت کرنا، دنیا سے منہ موڑنا، وحدۃ الوجود وغیرہ) مشترک ہیں۔

تصوف کے اس مفہوم کو پروموٹ کرنا کہ دنیا، دنیاوی لذات اور دنیاوی مشغولیتوں سے کنارہ کشی اختیار کی جائے اور ریاست وحکومت جیسے خالص دنیاوی بلکہ گندے معاملات میں نہ پڑا جائے۔ گویا اہل تصوف کو ذکر وفکر کی حلاوتوں تک محدود کرنا اور ریاست وحکومت کے معاملات اپنی مرضی سے چلانا۔

تصوف کا مطلب یہ ہے کہ سارے مذاہب سچے ہیں کیونکہ تصوف نام ہے انسانوں سے محبت اور لامحدود رواداری کا۔

تصوف کو دنیاوی وجاہت، دولت، سیاست اور طاقت کا منبع بنالینا۔

یہ کہنا کہ تصوف تو اہل اسلام کا فلسفہ ہے (گویا تصوف کا اصل مقصود تزکیہ نہیں بلکہ محض قیل وقال ہے)

تصوف کو تزکیے کی بجائے روحانی ترقی (؟) کا ذریعہ سمجھنا

کشف، انوار، کرامات کو تصوف کا مقصود ومنتہیٰ سمجھنا

- اشغال ومراقبات پر اس لیے عمل کرنا کہ اس سے ذہنی صحت اور یکسوئی حاصل ہوتی ہے۔
- وجد وحال اور مکاشفات کو معیار حق وباطل اور معیار قبولیت سمجھنا۔
- تصوف کو سرّیت سمجھنا اور اس کا ترجمہ Mysticism کرنا
- یہ کہنا کہ تصوف مسلمانوں کے دور زوال کی پیداوار ہے۔ گویا تصوف اور زوال لازم وملزوم ہیں یا تصوف زوال کا سبب اور اس کا مظہر ہے، یہ ترقی و خوشحالی کا دشمن ہے۔

- تصوف دنیا کے لیے نہیں بلکہ آخرت کی بہتری کے لیے ہوتا ہے۔

یاد رہے کہ یہ سب تصورات غلط، بے معنی اور جھوٹ کا پلندہ ہیں۔ تصوف وہ ادارہ ہے جو مسلمانوں نے اس لیے بنایا کہ وہ اللہ کی معصیت سے بچ سکیں اور دنیوی زندگی اسلامی احکام پر عمل کرتے ہوئے گزاریں تاکہ وہ دونوں جہانوں کی حسنات سمیٹ سکیں اور اپنے اللہ کی خوشنودی حاصل کرسکیں۔ گویا اس سے مقصود تزکیۂ نفس اور تربیت تھی یعنی تعمیر سیرت و کردار اور شخصیت کی صحیح خطوط پر نموء (Personality development)، اس سے مقصود نہ ترک دنیا تھی نہ رہبانیت۔ نہ یہ کوئی فلسفہ اور پراسرار علم تھا اور ہے بلکہ یہ قرآن وسنت کے واضح احکام پر مشتمل ہے۔ اس کا سادہ آغاز پہلی صدی ہجری کے آخر میں ہوگیا تھا اور تیسری صدی تک عالم اسلام کا شاید ہی کوئی علاقہ اور شہر ہو جہاں خانقاہ (تربیت گاہ) موجود نہ تھی لہٰذا یہ محض لاعلمی اور اتہام ہے کہ تصوف دورِ زوال کی پیداوار ہے۔ مسلمان صوفیاء نے عالم کفر میں اسلام کی تبلیغ اور مسلمان معاشرے کی اصلاح کے لیے ہی عظیم الشان خدمات انجام نہیں دیں بلکہ وہ سیاست کی اصلاح، جہاد اور دورِ زوال میں استعمار کی سیاسی اور مسلح مزاحمت میں بھی ہمیشہ پیش پیش رہے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ انہوں نے آگے بڑھ کر حکومت یا اقتدار پر قبضہ کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی (اور مسلمان حکومتوں کے ہوتے ہوئے اس کی ضرورت بھی نہ تھی اور نہ یہ کوئی شرعی فریضہ اور ضرورت تھی) ہاں! اس میں شک نہیں کہ مرورِ وقت سے جہاں دیگر مسلم اداروں میں انحطاط آیا ہے وہاں تصوف میں بھی غیر اسلامی افکار اور رسوم ورواج نے راہ پالی ہے اور آج بہت سے صوفیاء نے اسے محض دکانداری بنا رکھا ہے۔ اس لیے ضرورت تصوف کی اصلاح وتجدید کی ہے نہ کہ اس کے خاتمے کی اور اسے مغربی تصورات کے مطابق ڈھالنے کی۔

سیاسیات

سیاست کو دین سے الگ سمجھنا

اور یہی مغربی سیکولرزم ہے کہ اگر کوئی خدا کو مانتا ہے تو اپنی ذاتی اور انفرادی زندگی میں مانتا رہے، اجتماعی زندگی سے بہر حال اس خدا کا کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ گویا نعوذ باللہ یہ انسان طے کرے گا کہ خدا کا دائرہ کار کیا ہے اور کیا نہیں ہے؟ مغرب کے نظریۂ ہیومنزم کے مطابق چونکہ انسان اپنا خدا خود ہے اور وہ مختار کل اور قادر مطلق ہے لہٰذا یہ فیصلہ اسی کو کرنا ہے کہ 'مذہب' کا کردار اس کی زندگی میں کیا ہونا چاہیے؟ اس کے برعکس اسلام نام ہی اللہ کی غیر مشروط اطاعت کا ہے۔ اسی لیے اردو والے سیکولرزم کا ترجمہ لادینیت کرتے ہیں اور اسی لیے اقبال نے کہا ہے کہ ؎

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

پاکستانی ایک قوم ہیں

اسلامی تعلیمات کی رُو سے اجتماعیت کی بنیاد اسلام ہے اور جو لوگ اسلام قبول کرکے (یعنی مسلمان ہوکر) اسلامی اصولوں کی بنیاد پر اپنی اجتماعیت کی تشکیل کرتے ہیں، وہ ایک قوم اور ملت ہوتے ہیں گویا قومیت کی بنیاد اسلامی نظریہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر سیاسی وانتظامی مصالح کا تقاضا ہو تو مسلم مملکتیں ایک سے زیادہ ہوسکتی ہیں لیکن الگ علاقے اور حکومت کی بنیاد پر وہ الگ قوم اور ملت نہیں بن جائیں گی، نہ ان میں ویزے، پاسپورٹ کا سلسلہ ہوگا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ابن بطوطہ افریقہ کا رہنے والا تھا لیکن وہ جس اسلامی ملک میں چاہتا تھا جاتا تھا، وہاں شادی کرلیتا تھا اور قاضی (جج) مقرر ہوجاتا تھا۔

مغرب کا فلسفہ نیشنلزم ہے یعنی قومیت کی بنیاد وطنیت ہے اور وطنیت کی بنیاد علاقے، زبان، نسل اور رنگ وغیرہ کا اشتراک ہے۔ اس سے نیشن سٹیٹ تھیوری وجود میں آئی یعنی ایک ریاست میں رہنے والے ایک قوم ہیں اور یہی امر سارے سیاسی اور

دنیوی مفادات کا منبع ہے۔

تقسیم سے پہلے ہندوؤں کا موقف یہی تھا کہ ہم ہندو مسلمان، پارسی ...... سب بحیثیت ہندوستانی ایک قوم ہیں، انگریز سے آزادی چاہتے ہیں لہٰذا ہمیں مل کر آزادی کی جدوجہد کرنی چاہیے۔ لیکن اقبال اور قائداعظم نے کہا کہ نہیں! ہم اشتراک وطن کی بنا پر ایک قوم نہیں ہو سکتے بلکہ ہم مسلمان ہونے کی بنا پر الگ قوم ہیں۔ یہی نظریۂ پاکستان تھا۔ علماء کا ایک گروہ بھی چونکہ ہندوؤں کے اس فلسفے کو تسلیم کرتا تھا اسی لیے اقبال کو کہنا پڑا کہ ؎

عجم ہنوز نداند رموز دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است

سرود برسر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

حب وطن ایمان کا حصہ ہے

مغرب میں وفاداری کا مرکز نیشن سٹیٹ ہے یعنی ایک وطن کی بنیاد پر بننے والی ریاست۔ اس کے برعکس مسلم روایت دارالاسلام، دارالکفر اور دارالحرب وغیرہ کی اصطلاحات استعمال کرتی ہے۔ یعنی ایک مسلمان کی وفاداری کا مرکز 'وطن' ہر قیمت پر' نہیں ہوتا بلکہ صرف اسلام کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اور اگر فرد وہاں اسلام کے مطابق زندگی بسر نہ کر سکے تو اسلام اسے اس وطن سے ہجرت کر جانے کا حکم دیتا ہے کہ وہ ایسی جگہ چلا جائے جہاں اس کے لیے اسلامی احکام کے مطابق زندگی بسر کرنا ممکن ہو لہٰذا ایک مسلمان کے لیے وفاداری کا آخری مرکز ''وطن'' یا ''ریاست'' نہیں بلکہ [illegible] ہے۔

جمہوریت اور 'اسلامی جمہوریت'

مغرب میں فرد چونکہ مختار کل اور قادر مطلق ہے اور جو چاہے کر سکتا ہے اور جیسے چاہے زندگی بسر کر سکتا ہے، لہٰذا ایک مغربی نیشن سٹیٹ میں جب افراد مل کر 'عوام' بنتے ہیں یا افراد اپنے ''نمائندوں'' کو ریاست کی پارلیمنٹ میں بھجواتے ہیں تو یہ ''عوام'' اور ''عوامی نمائندے'' بھی فرد کی طرح معصوم عن الخطا، مختار کل اور قادر مطلق ہوتے ہیں۔ یہی جمہوریت ہے۔

اس کے برعکس مسلم سیاسی روایت میں انسان ہمیشہ اللہ کے عبد رہتے ہیں خواہ وہ ایک عام فرد ہو یا کسی ریاست کا سربراہ۔ گویا ریاست اور اس کا سارا نظام اللہ کے قانون یعنی اسلام کے ماتحت ہوتا ہے اور مسلمان مل کر باہم مشاورت سے ملک کا نظام چلاتے ہیں۔

اب آپ خود فیصلہ کر لیجیے کہ یہ جو ''مغرب کی جمہوریت'' ہے وہ ''اسلامی'' کیسے ہو سکتی ہے؟ یا ایک اسلامی مملکت کے شورائی نظام کو 'جمہوریت'' کیسے کہا جا سکتا ہے؟

آمریت مردہ باد لیکن؟

اسلامی تعلیمات کی رُو سے سیاسی استبداد اور ظلم کا راستہ بہرحال غلط ہے اور مسلمان حکمران کو مسلمان عوام کی مرضی اور مشاورت ہی سے برسر اقتدار آنا چاہیے اور ان کی مرضی نہ ہو تو اقتدار چھوڑ دینا چاہیے۔ گویا آمریت غیر اسلامی ہے خواہ وہ کسی بھی مسلم ملک میں ہو، عراق میں یا پاکستان میں یا سعودی عرب میں۔ لیکن اس کا کیا جواز بنتا ہے کہ مغرب مسلمان معاشرے میں آمریت کی جگہ ''مغربی جمہوریت'' لا کر نافذ کر دے جو اپنی اصل میں سو فیصد کفر کے مماثل ہے۔ لہٰذا صدام حسین کی آمریت بلاشبہ بری تھی لیکن بش کی آمریت ۔ معاف کیجیے گا ۔ ''جمہوریت'' اس سے سو گنا زیادہ بری ہے۔ امریکہ جب یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ مشرق وسطیٰ میں آمریت کی جگہ ''جمہوریت'' لانا چاہتا ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ مغربی

تہذیب کو یونیورسلائز کرنا چاہتا ہے اور اپنی لادینیت اور کفر کو مسلم معاشروں پر زبردستی، طاقت کے زور سے، مسلط کرنا چاہتا ہے۔ پاکستان میں اور عرب ممالک میں اس وقت بلاشبہ آمریت ہے اور بلاشبہ یہ بری ہے، یہ غیر اسلامی ہے لیکن اس کا یہ مطلب کب ہے کہ ہم اس سے جان چھڑا کر مغرب کی ''جمہوریت'' کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیں جو سراسر کفر اور لادینیت ہے۔

'نمائندگی' کا تصور

اسلامی تعلیمات کی رو سے چونکہ بزرگی اور قیادت کا معیار تقویٰ اور صلاحیت[1] ہے لہٰذا اس کا تقاضا ہے کہ مسلمانوں کے جو نمائندے ہوں وہ تقویٰ اور صلاحیت کے لحاظ سے معاشرے کی کریم ہوں یعنی وہ تقویٰ اور صلاحیت کے لحاظ سے سارے مسلمانوں سے بڑھ کر ہوں اور اقتدار کے ہرگز حریص نہ ہوں بلکہ عوام انہیں مجبور کریں کہ وہ ان کی ریاست کا نظام سنبھالیں تاکہ معاشرے کا اجتماعی نظام عوام کے عقائد و اقدار کے مطابق احسن ترین طریقے سے چل سکے۔ مسلم معاشرے کے افراد چونکہ عبد ہوتے ہیں یعنی اللہ کی غیر مشروط اطاعت کے اصول پر کام کرتے ہیں لہٰذا ان کے نمائندے بھی اسی اصول پر عمل کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی غیر مشروط اطاعت کے اصول پر عمل کرتے ہیں۔

اس کے برعکس مغرب کا اصولِ نمائندگی اور نظامِ جمہوریت آپ نے دیکھ لیا کہ چونکہ فرد وہاں مختار کل اور اپنا خدا خود ہوتا ہے لہٰذا اس کے نمائندے بھی مختار کل اور قادر مطلق ہوتے ہیں اور پارلیمنٹ میں جو قانون چاہیں پاس کر سکتے ہیں۔ وہ چاہیں تو شراب کو حلال کر سکتے ہیں، لواطت کو جائز قرار دے سکتے ہیں، نکاح کو غیر ضروری قرار دے سکتے ہیں ...... وغیرہ جیسا کہ ہمارے سامنے مغرب میں ہو رہا ہے۔

۱۔ القصص ۲۸: ۲۶

ووٹ کی مساوات۔گدھا گھوڑا برابر

مغربی جمہوریت میں چونکہ 'فرد' ہر چیز کا مالک و مختار ہے لہٰذا ہر فرد کا ووٹ برابر ہے چاہے فرد غنڈا ہو اور چاہے متقی و پرہیز گار۔اس کے برعکس اسلام کے سیاسی نظام میں بھی ہر فرد مشورے کا اہل اور حقدار ہے لہٰذا ریاست کا نظام چلانے میں اس کا مشورہ بھی ضروری ہے لیکن یہاں گدھا اور گھوڑا برابر نہیں ہیں۔یہاں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ایک عام بدو کی رائے (یعنی اس کا ووٹ) برابر نہیں ہوتے، نہیں ہو سکتے۔اسی لیے اقبال کو کہنا پڑا کہ ؎

جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

بلاشبہ گننے کے بجائے تولنے کا عمل ضروری ہے اور یہ مسلم مفکرین اور مجتہدین کا کام ہے کہ وہ ''مشاورت'' اور ''اہلیت'' کے اسلامی اصولوں کے لیے آج کے عصری تقاضوں کے مطابق طریق کار تجویز کریں اور مسلمان حکمرانوں کا فرض ہے کہ وہ اخلاص نیت سے اسے نافذ کریں۔

آئین ۔ مقدس گائے

مغرب کی ''نیشن اسٹیٹ تھیوری'' اور ''فرد کی حاکمیت'' کی تھیوری آپ جان چکے۔اب ان دونوں کا تقاضا یہ تھا کہ فرد اور اس کے نمائندے اس ریاست کو چلانے کے لیے جو نظام تجویز کریں، اسے وفاداری کا آخری مرکز بنایا جائے اور تقدیس کا اعلیٰ ترین مقام دیا جائے (گویا ہندوؤں کے عقائد کے مطابق وہ مقدس ترین گائے ہو جسے ہاتھ بھی نہیں لگایا جاسکتا) تا کہ کوئی اس کی خلاف ورزی کی جرأت نہ کر سکے۔ چنانچہ مغربی جمہوریت میں ریاستی ''آئین'' کی بالادستی سے انکار بدترین جرم ہے، یہ بغاوت ہے، یہ ریاست کے وجود کے انکار کے مترادف ہے، اس کی سزا موت ہے اور

اس کو نہ ماننے والا اس ریاست کا شہری نہیں رہ سکتا۔ عدالتیں آئین کے مطابق فیصلے کرنے کی پابند ہیں، مقننہ اس کے خلاف کوئی قانون سازی نہیں کر سکتی اور انتظامیہ اس کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی۔ غرض مغرب کی سیاسی فکر کے مطابق آئین وہ اعلیٰ ترین دستاویز ہے جس کے خلاف ریاست میں پتا بھی نہیں ہل سکتا اور آئین کو ریاست میں وہ اقتدار حاصل ہے جو نعوذ باللہ مسلمانوں میں قرآن مجید کو بھی حاصل نہیں کیونکہ مسلمان قرآن مجید کا عزت و احترام تو واقعی بہت زیادہ کرتے ہیں لیکن اپنے ریاستی نظام میں آج کل اسے عملاً وہ حیثیت (بدقسمتی سے) نہیں دیتے جو مغربی سیاست میں آئین کو حاصل ہے۔

مغرب کے زیر اثر مسلمان ممالک میں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔ ہر مسلم ریاست کا ایک آئین ہے اور یہ آئین مغرب ہی کی طرح مقدس سمجھا جاتا ہے۔ ۵۷ مسلم ممالک میں سے صرف چند ممالک کے آئین میں مسلم عوام کی اشک شوئی کے لیے یہ لکھا گیا ہے کہ یہاں اللہ کی حاکمیت ہوگی، قرآن و سنت ماخذ قانون ہوں گے...... وغیرہ لیکن عملاً قرآن و سنت کو وہ مقام کہیں بھی حاصل نہیں جو مغرب میں آئین کو حاصل ہے۔

سیاسی جماعتیں اور اقتدار کے لیے مسابقت

مغرب نے انتقال اقتدار کے لیے سیاسی جماعتیں منظم کرنے کا طریقہ اپنایا۔ یہ سیاسی جماعتیں ہر چند سال بعد الیکشن میں حصہ لے کر اقتدار کے لیے مسابقت کرتی ہیں اور جو جیت جائے وہ حکومت بنا لیتی ہے اور دوسری اس پر چیک رکھتی اور اس کی مخالفت کرتی ہے۔ جن مسلم ممالک نے اس جمہوریت کا تجربہ کیا ہے وہاں دیکھا گیا ہے کہ سیاسی جماعتوں پر بعض طاقت ور افراد اور گروپوں کا قبضہ ہو جاتا ہے اور وہ اسے جدھر چاہتے ہیں لے جاتے ہیں یہاں تک کہ بعض سیاسی جماعتیں دشمنوں کی آلہ کار بن کر ملک توڑنے کا سبب بھی بن جاتی ہیں۔ ان سیاسی جماعتوں سے صوبہ پرستی، علاقہ

پرستی، فرقہ واریت، لسانی عصبیتیں اور اسی طرح کی دوسری بیماریاں فروغ پاتی ہیں۔ خفیہ ایجنسیاں حکمرانوں کی مصلحت کے لیے سیاسی جماعتوں کو آپس میں لڑاتی ہیں اور یوں معاشرے میں انتشار اور افتراق پیدا ہوتا ہے۔ بعض سیاسی جماعتیں اقتدار کے لیے سپر پاورز کا سہارا بھی لیتی ہیں اور ان کی اس خود غرضی سے ملک کا سب کچھ داؤ پر لگ جاتا ہے۔

خود امیدواری اور خودستائشی

مغربی جمہوریت میں مختلف سطحوں پر عوامی نمائندگی کے لیے فرد کو خود امیدوار بننا پڑتا ہے اور اپنی خوبیاں عوام کے سامنے جا کر گنوانا پڑتی ہیں اور انتخابی مہم کے لیے خطیر رقوم اپنی جیب سے خرچ کرنا پڑتی ہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے یہ سب کچھ نا قابل قبول ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اقتدار کی خواہش سے منع کیا ہے[1] اور مسلم روایت میں یہ بھی سخت ناپسندیدہ ہے کہ آدمی اپنی تعریفیں خود ہی کرنے لگے کہ میں ایسا اور ایسا ہوں لہٰذا مجھے ووٹ دو۔ اور پھر اس کے لیے اپنی جیب سے پیسا بھی خرچ کرے کہ مجھے اسمبلیوں میں بھیجو تا کہ میں وزیر، صدر، وزیر اعظم وغیرہ بن سکوں۔ ان باتوں کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

سیاست۔ ایک فل ٹائم مکروہ پیشہ

مغربی جمہوریت نے جو نظام تجویز کیا ہے اس میں جو شخص سیاست کرتا ہے وہ کوئی دوسرا کام نہیں کر سکتا۔ یہ گویا ایک فل ٹائم پیشہ (profession) بن کر رہ گیا ہے اور جو آدمی یہ کام کرے وہ نہ تو کوئی ملازمت کر سکتا ہے اور نہ تجارت و حرفت کو اپنا سکتا ہے جبکہ اس کے لیے کثیر سرمایہ بھی درکار ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سیاست میں صرف وہ لوگ آتے ہیں جو سرمایہ دار ہیں یا جن کو جاگیریں اور سرمایہ ورثے میں ملتا ہے اور

۱۔ مسند احمد بن حنبل جلد ۴، صفحہ ۳۹۳، المکتب الاسلامی، بیروت، ۱۹۸۳ء

غریب ومتوسط طبقے کے عام شریف آدمی اس میں شرکت کا سوچ بھی نہیں سکتے۔یوں سیاست میں کامیابی کے لیے لوگ ہر جائز و ناجائز طریقے سے سرمایہ اکٹھا کر کے خرچ کرتے ہیں اور جب کامیاب ہو کر وزیر وغیرہ لگ جاتے ہیں تو پھر ملک وقوم کے خزانے کو دونوں ہاتھوں سے، ہر جائز و ناجائز طریقے سے،لوٹتے ہیں تاکہ اپنے اخراجات مع سود وصول کریں۔اس طرح مغربی جمہوریت وسیاست ایک ایسا بدی کا چکر (vicious circle) ہے جس کی ابتدا بھی جھوٹ،فریب،دغابازی ہے اور انتہا بھی۔

ریاست کا لامحدود دائرہ کار

مغربی نظام میں آہستہ آہستہ ریاست کا دائرہ کار بڑھ کر اتنا پھیل گیا ہے کہ زندگی کا ہر شعبہ اپنی پوری تفصیل کے ساتھ اس کی لپیٹ میں آ گیا ہے یہاں تک کہ فرد کی آزادی اب محض برائے نام رہ گئی ہے۔ماضی میں بھی حکمران جو چاہتے تھے کرتے تھے لیکن اب تو صورت یہ ہے کہ ریاست اور حکومت (بالفاظ دیگر عوامی نمائندوں اور حکمرانوں) کی مرضی کے بغیر معاشرے میں پتا بھی نہیں ہل سکتا۔قانون سازی ان کے ہاتھ میں ہے، انتظامیہ میں وہی ہوتے ہیں،بعض ملکوں میں اعلیٰ عدلیہ کی منظوری بھی ایوان بالا سے لی جاتی ہے۔نچلی سطح پر لوکل باڈیز میں بھی وہی ہوتے ہیں اور یوں عوام کے چھوٹے بڑے سارے مسائل کا حل انہی کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

مسلم روایت میں قانون سازی یعنی اجتہاد (فقہ و اصول فقہ) کا کام صدیوں پرائیویٹ سیکٹر میں ان علماء کے ہاتھ میں رہا ہے جن کے علم وتقویٰ پر (بغیر کسی سرکاری انتخاب کے) عوام کو اعتماد ہوتا تھا۔تعلیم بھی شروع ہی سے غیر حکومتی سطح پر فعال طریقے سے منظم رہی ہے۔دینی زندگی کی تنظیم بھی ریاستی کنٹرول سے باہر تھی جیسے مساجد کا نظام چلانا، رمضان میں افطار کا اہتمام کرنا، زکوٰۃ دینا، حج کرنا اور صدقات وانفاق سے وقف قائم کرنا اور دوسری دینی رسمیں بجالانا وغیرہ۔فلاحی کام جیسے سرائے کا قیام (جہاں مسافر ٹھہر سکیں) کنویں کھدوانا، (پانی کی فراہمی) اور طبی سہولتوں کی فراہمی کے

لیے شفا خانوں کا قیام و انصرام بھی ریاستی/حکومتی قدغنوں کے بغیر پرائیویٹ سیکٹر میں ہوتا تھا لیکن آج کے مغربی نظام سیاست میں ان میں سے اکثر امور ریاستی گرفت میں چلے گئے ہیں اور ریاست اتنی طاقت ور ہوگئی ہے کہ کوئی اس کے آگے پَر نہیں مار سکتا۔ یوں مغرب کے جمہوری نظام کے تحت ریاستی جبر نے فرد/ پرائیویٹ سیکٹر کی آزادی سلب کر لی ہے اور اس کے دائرہ کار کو محدود کر دیا ہے جو مسلم روایت کے بالکل خلاف ہے۔

اقامتِ دین اور حکومتِ الٰہیہ

مغرب کی اس فکر نے کہ دنیا کی زندگی ہی سب کچھ ہے، دیگر عوامل کے ساتھ مل کر جو دنیوی عروج اسے عطا کیا اور قرون متاخرہ میں بعض صوفیوں کے ہاں دنیا سے گریز کے رجحانات کے ردعمل میں بعض مسلم مفکرین و مصلحین نے یہ سوچا کہ مسلمانوں کا ترجیح آخرت اور توکل و قناعت پر غیر ضروری اصرار اور دنیا کو اہمیت نہ دینا غلط ہے چنانچہ انہوں نے زور دے کر یہ کہنا شروع کیا کہ اسلام ایک نظام زندگی ہے، اسلام ایک تحریک ہے، یہ دنیاوی کامیابی کی ضمانت دیتا ہے بلکہ اسلام کا بنیادی نصب العین ہی یہ ہے کہ دنیا میں اسلامی حکومت قائم کی جائے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے سیاسی جماعتیں بنا کر اسلامی مقاصد کے لیے اقتدار کے حصول کی جدوجہد شروع کر دی اور مسلم حکمرانوں کے حریف بن کر سامنے آئے۔ انہوں نے مغرب سے درآمد کردہ جمہوری نظام کے اندر رہ کر اقتدار کی منافست کا طریقہ قبول کر لیا اور یوں مغربی جمہوریت کی ساری خرابیاں ان کے اندر بھی درآئیں۔

اس طرز عمل نے اسلام کی ایک مخصوص سیاسی تعبیر کو فروغ دیا اور سیاست اور اسلام مساوی ہو کر رہ گئے۔ اس کے نتیجے میں اسلامی فکر کے دیگر شعبوں کو زک پہنچی اور دعوت و تبلیغ، اصلاح و تزکیہ، تعلیم و تربیت اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر جیسے اسلامی تصورات اور ادارے ان اسلامی جماعتوں کی ترجیحات میں بہت پیچھے چلے گئے۔ یوں نہ صرف نظری سطح پر اسلام کا نصب العین اور اس کی بنیادی ترجیحات کا نظام تلپٹ ہو کر رہ

گیا بلکہ مسلم معاشرے میں ایمان و یقین کی کمزوری اور فکر آخرت اور اسلام کی روحانی قدروں سے تغافل کی وجہ سے اخلاق قدریں بھی زوال پذیر ہوئیں اور مغربی اقدار نے تیزی سے ان کی جگہ لینی شروع کر دی۔ یوں اس وقت ایک طرف سیاسی میدان میں امریکہ مردہ باد اور اسلامی انقلاب زندہ باد کے نعرے بھی گونجتے ہیں لیکن عملاً مغربی فکر و تہذیب کو قبول کرنے کے لیے مسلم معاشرے بشمول اسلامی تحریکوں کے افراد اور اداروں نے سارے دروازے چوپٹ کھول رکھے ہیں اور مغربی تہذیب کا سیلاب ہر اسلامی قدر اور روایت کو بہائے لیے چلا جا رہا ہے۔

دین کی ہوا خیزی

مغربی جمہوریت کے طریقوں اور تقاضوں کے مطابق سیاست کرتے ہوئے جب علماء کرام اور دینی جماعتوں نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا تو وہ ان ساری خرابیوں میں مبتلا ہو گئیں جن میں سے چند ایک کا پہلے ذکر ہو چکا ہے مثلاً مسلم حکمرانوں کا حریف بننا، اقتدار کی خواہش کرنا اور اس کے لیے دن رات جدوجہد کرنا، حکومتی مناصب کے لیے خود امیدوار بننا اور اپنی خوبیاں گنوانا، اپنے سیاسی مخالفوں میں سارے عیوب ظاہر و ثابت کرنے کی کوشش کرنا، اقتدار کے لیے دوسرے دینی عناصر کا مقابلہ کرنا اور یوں ایک دوسرے کی پگڑی اچھالنا، عصبیت جاہلیہ کی طرح اپنے اپنے فقہی و کلامی مسلک کے پیروکاروں کے جتھے بنانا اور انہیں دوسرے دینی عناصر کے خلاف متحرک کرنا، زکوٰۃ و صدقات کی رقوم سیاسی کاموں میں خرچ کرنا، اخبارات اور ٹی وی میں تصاویر اور بیانات چھپوانا اور اپنے حق میں پروپیگنڈا کرنا، بعض دینی عناصر کا حکومتوں سے مل جانا، ان کی ناجائز حمایت کرنا اور دنیوی فائدے اٹھانا، اقتدار کو ہدف بنا کر دن رات جدوجہد کرتے ہوئے دعوت و تبلیغ، اصلاح و تزکیہ، تدریس و تحقیق اور دوسرے اہم دینی کاموں سے صرف نظر کر لینا اور اپنے سیاسی کام ہی کو پورا دین بنا کر پیش کرنا۔ ان ساری باتوں سے دین کی ہوا خیزی ہوئی، دینی مفادات کو نقصان

پہنچا، آخرت کی فکر، للّٰہیت، اخلاص، سادگی، توکل وقناعت، زہد وتقویٰ اور کثرت ذکر ونوافل وغیرہ کا رجحان کمزور ہوا اور حب دنیا، مادہ پرستی اور حب جاہ و مال کو فروغ حاصل ہوا۔ اور جب دین کی گرفت کمزور ہوئی تو مغربی فکر وتہذیب کی مزاحمت بھی کمزور ہوئی چنانچہ مغربی تہذیب کا سیلاب اب دینی گھرانوں میں بھی داخل ہو چکا ہے بلکہ پوری دینی زندگی ہی اس کی زد میں ہے اور خدشہ ہے کہ اب یہ عمارت گری کہ گری، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ.

قانون اور عدلیہ

قانون سازی بذریعہ حکومت

مغربی جمہوریت میں قانون سازی بذریعہ مقننہ/ پارلیمنٹ ہوتی ہے جو عوامی نمائندوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اسی کے ارکان حکومت بناتے ہیں، چنانچہ ۹۹ فیصد قانون سازی حکومت کرتی ہے، جس کے اپنے مخصوص مفادات ہوتے ہیں۔

اسلام میں قانون دینے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے۔ مسلمانوں (یعنی ان کے عالم اور متقی لوگوں) کو صرف اس بات کا اختیار ہے کہ قرآن وسنت کے احکام کی تشریح کر سکیں اور نو پیش آمدہ مسائل میں قرآن وسنت کی نصوص کی روشنی میں اجتہاد کر سکیں۔ مسلم روایت میں یہ کام ہمیشہ حکومت سے باہر پبلک سطح پر ہوا ہے، چنانچہ امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کسی حکومتی اختیار سے مسلح نہیں تھے لیکن امت صدیوں سے ان کے بنائے ہوئے قوانین پر عمل کر رہی ہے۔

قانون سازی منتخب نمائندوں کا حق

مغربی جمہوریت میں قانون سازی کا اختیار عوام کے منتخب نمائندوں کو ہوتا ہے جسے وہ پارلیمنٹ میں استعمال کر کے قانون بناتے ہیں۔

مسلم روایت میں قانون سازی نہیں بلکہ اجتہاد اور قرآن وسنت کی تشریح کے

لیے علمی صلاحیت اور تقویٰ شرط ہے۔ جو افراد (علماء) ان دو صلاحیتوں کے حامل ہوں انہیں خود بخود مسلمان عوام کی حمایت حاصل ہو جاتی ہے جیسا کہ ماضی میں ہمیشہ ہوا۔ مغرب کی پیروی میں آج کل مسلمان جمہوری ممالک میں جو طریق انتخاب مروج ہے اس میں عموماً ایسے لوگ منتخب ہوتے ہیں جو قرآن، حدیث، فقہ و اصول فقہ اور عربی زبان کا معمولی علم بھی نہیں رکھتے، وہ مسلمانوں کے لیے اجتہاد کیا خاک کریں گے؟ اور مسلمان عوام ان کے اجتہاد پر اعتماد کیسے کریں گے؟

پارلیمنٹ جو قانون چاہے بنا سکتی ہے

چونکہ فرد مغرب میں اپنا خدا خود ہے اور مختار مطلق ہے، لہٰذا اس کے نمائندے بھی ہر پابندی سے آزاد اور مختار مطلق ہوتے ہیں اور پارلیمنٹ میں جو قانون چاہیں بنا سکتے ہیں۔ وہ چاہیں تو گدھے کو گھوڑا قرار دے سکتے ہیں اور مرد کو عورت جیسا کہ مغرب کی کئی پارلیمانوں نے حال ہی میں ہم جنس پرستوں کو شادی کی اجازت دے دی ہے اور اس سے پہلے وہ شراب، جوا اور زنا وغیرہ کو حلال قرار دے چکے ہیں۔

مسلم روایت میں قانون دینے والی اللہ کی ذات ہے اور مسلمانوں کے علماء اپنی طرف سے جو قانون چاہیں بنا کر نہیں دے سکتے۔ اور نہ وہ اللہ و رسول کے بنائے ہوئے کسی قانون کو ختم کر سکتے ہیں اور نہ اس میں ترمیم کر سکتے ہیں، وہ صرف نصوص کی تشریح اور اجتہاد کر سکتے ہیں۔

جج کی اہلیت

مغربی فکر کے مطابق عدلیہ کے جج کو ریاستی آئین و قانون کا ماہر ہونا چاہیے۔ اس کے برعکس مسلم روایت کے مطابق قاضی کو قرآن وسنت اور فقہ و اصول فقہ کا ماہر ہونا چاہیے لیکن چونکہ ہمارے کالجوں میں صرف مغرب کا قانون پڑھایا جاتا ہے اور قرآن و سنت، فقہ و اصول فقہ اور عربی زبان کی کما حقہ تعلیم نہیں دی جاتی اس لیے ہماری عدالتوں کے اکثر جج صاحبان قرآن وسنت کے مطابق فیصلے کرنے کی اہلیت ہی نہیں

رکھتے۔ بلاشبہ ہمارے اکثر جج صاحبان لائق اور ذہین ہوتے ہیں۔ ان میں بہت سے اچھے اور نیک بھی ہوتے ہوں گے لیکن وہ بھی کیا کریں ان کی اسلامی تعلیم و تربیت کا نظام ہی موجود نہیں۔

جج آئین کے مطابق فیصلے کرتے ہیں

مغربی فکر و تہذیب کے مطابق جج ملکی آئین کے مطابق فیصلے کرتے ہیں کیونکہ وہ آئین ہی کے مطابق حلف اٹھاتے اور اس کی پاسداری کا عہد کرتے ہیں۔ اس کے برعکس مسلم روایت میں مغرب کی طرح آئین کی تقدیس کا کوئی تصور نہیں بلکہ مسلمان قاضی اپنے ایمان کی رو سے قرآن و سنت کے مطابق فیصلے کرنے کے پابند ہوتے ہیں اور ان کی مخالفت کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

فوری انصاف

موجودہ پاکستانی قوانین انگریزی قانون پر مبنی اور اس کا تسلسل ہیں جن کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ یہ پروسیجرز پر انحصار کرنے والا قانونی نظام ہے لہٰذا تاخیر کو جنم دیتا ہے۔ خصوصاً اس کا سول لاء یعنی قانون دیوانی تو دیوانہ کرنے والا ہے۔ بندہ ختم ہو جاتا ہے لیکن مقدمہ ختم نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس اسلامی فقہ میں اتنے لمبے چوڑے پروسیجر نہیں ہوتے لہٰذا فیصلہ جلد ہو جاتا ہے۔ خود انگریزی زبان کا محاورہ ہے کہ انصاف میں تاخیر انصاف کی نفی کے مترادف ہے۔

انصاف بکتا ہے

مغربی عدالتی نظام میں مقدمے کی مالیت کے لحاظ سے سائل کو فیس پہلے جمع کروانا پڑتی ہے اور انصاف بعد میں ملتا ہے۔ مسلم روایت میں اس طرح انصاف خریدنے کا کوئی تصور نہیں خواہ مقدمہ کی مالیت کچھ بھی ہو۔ بلکہ یہ ریاست کی ذمہ دار ہے کہ وہ عوام کے لیے سستے اور فوری انصاف کا انتظام کرے چنانچہ مسلم عدالتی نظام میں

کوئی فیس اور سٹیمپ ڈیوٹی نہیں ہوتی، وکیلوں کا بھاری خرچہ نہیں ہوتا اور فیصلے فوری ہوتے ہیں۔

وکالت کا نظام

مغرب کا نظام قانون اتنا پیچیدہ ہے کہ وکالت کا ایک پورا سسٹم کام کرتا ہے اور عام آدمی خواہ کتنا پڑھا لکھا اور عالم فاضل ہی کیوں نہ ہو، اپنے مقدمے کی پیروی خود نہیں کر سکتا۔ مسلم نظام انصاف میں نہ وکلاء کی یہ فوج ہوتی تھی اور نہ وہ موجودہ صورت حال کی طرح نظام عدل کا ایک ناگزیر حصہ تھے۔ عدالت کی معاونت کے لیے مفتی ہوتے تھے جن کو تنخواہ حکومت سے ملتی تھی۔ مدعا علیہ قاضی کے پاس جاتا، اگر کوئی بات تنقیح طلب ہوتی تو قاضی صاحب مفتی صاحب سے مشورہ کر لیتے اور گواہوں کو سن کر دو چار دن میں فیصلہ کر دیتے۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

نہ کرپشن نہ دباؤ

مغربی تہذیب کے مطابق قائم کردہ عدلیہ کا ایک مسئلہ تو یہ ہے کہ کرپشن اس میں رچ بس چکی ہے (خصوصاً نچلی سطح پر) اور جج حکومتی دباؤ کے پیش نظر حق وانصاف کے مطابق فیصلے نہیں کر سکتے (خصوصاً اعلیٰ سطح پر)۔

مسلم روایت میں عدلیہ ان دونوں خرابیوں سے پاک ہوتی ہے۔ قاضی اکثر ان لوگوں کو مقرر کیا جاتا ہے جو متقی اور پرہیزگار ہوتے ہیں اور قاضی بننا ہی نہیں چاہتے چنانچہ وہ حکمرانوں کا دباؤ بھی قبول نہیں کرتے بلکہ جہاں ناجائز دباؤ کا واضح خطرہ ہو وہ (امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ کی طرح) کوڑے کھا لیتے ہیں قاضی بننا قبول نہیں کرتے۔ اور یہ بھی مسلم قاضیوں کی روایت ہے کہ وہ ہمیشہ کھل کر حکمرانوں کے خلاف فیصلے دیتے رہے ہیں جس کی مثالیں خلافت راشدہ سے شروع ہو گئی تھیں، جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف قاضی نے فیصلہ دیا اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ جیسی ہستی کی گواہی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

معیشت

یہ سمجھنا کہ سود کے بغیر آج کی معیشت نہیں چل سکتی

- مسلمان ملکوں کا یہودی سود خوروں کے مالیاتی اداروں (آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک وغیرہ) سے قرض لینا اور یہ سمجھنا کہ اس سے ان کی معیشت کو سہارا ملے گا اور وہ بہتر ہو جائے گی۔
- یہ باور کرنا کہ بنکوں کے بغیر انڈسٹری نہیں چل سکتی اور سود کے بغیر بنک نہیں چل سکتے اور انڈسٹری کے بغیر کوئی ملک آج زندہ نہیں رہ سکتا لہٰذا بنک اور سود آج کی معیشت کے لیے ناگزیر ہیں۔
- مسلمانوں میں سود کے لفظ کی کراہت کو دیکھتے ہوئے اس کی بجائے منافع، انٹرسٹ، نفع نقصان کا کھاتہ (Profit and Loss A/c) جیسے الفاظ استعمال کرنا۔
- یہ سمجھنا کہ فری مارکیٹ اکانومی اور ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن (WTO) کے گلوبلائزیشن کے لیے اقدامات مسلمان ملکوں کے معاشی مفاد میں ہیں۔
- مسلمان ملکوں کا اپنی فاضل دولت امریکی و یورپی بنکوں میں رکھنا اور یہ سمجھنا کہ وہاں یہ زیادہ محفوظ ہے اور اس پر سود وصول کرنا۔
- ہر مسلمان ملک کے وزیر مالیات کا یہودی مالیاتی اداروں (ورلڈ بنک، آئی ایم ایف وغیرہ) اور امریکہ و یورپ کی منظوری سے مقرر ہونا اور اکثر و بیشتر انہی اداروں کے تربیت یافتہ افراد کا اس اہم وزارت پر تقرر تاکہ یہ بات یقینی ہو جائے کہ اس ملک کی معاشی پالیسیاں ان اداروں اور مغربی حکومتوں کی مرضی کے مطابق چلیں گی۔
- ایسے بین الاقوامی معاہدوں کو قبول کرنا جن کی رو سے کافر اور دشمن ممالک کو (جو آپ کے وجود کو ختم کرنے کے درپے ہیں) 'بہترین دوست ملک' قرار دینا

پڑے اور ان سے زبردستی تجارت کرنا پڑے۔

- مغربی حکومتوں اور مالیاتی اداروں کا مسلمان ملکوں کو اپنی مصنوعات بیچتے رہنا لیکن ان کو وہ بنیادی ٹیکنالوجی اور مہارت نہ مہیا کرنا، جس سے وہ خود کفیل ہوسکیں۔
- مسلمان ملکوں کا اپنی کرنسی کو ڈالر سے منسلک رکھنا۔
- سود اور سٹے پر مبنی کاروبار کرنا۔
- جعلی حسابات رکھنا۔
- دو نمبر مال بنانا اور بیچنا۔

معیار زندگی کی دوڑ میں شمولیت

یہ خالص مغربی تصور ہے جو دنیا پرستی پر مبنی ہے اور اس کا کم سے کم نقصان یہ ہے کہ ایک مسلمان اپنی ساری صلاحیتیں اور توانائیاں زیادہ کمانے کی خاطر لگا دیتا ہے اور ہر وقت اسی ادھیڑ بن میں گرفتار رہتا ہے کہ کیسے زیادہ کمائے اور اپنا معیار زندگی کیسے بلند کرے؟

- راتوں رات امیر بننے کی خواہش اور اس کے لیے ہر جائز و ناجائز راستہ اختیار کرنا جیسے چوری و ڈاکہ زنی، منشیات فروشی، سمگلنگ، قتل و غارت گری، دشمن ملک کی ایجنسیوں کے لیے کام کرنا، دھوکہ دہی، کرپشن وغیرہ۔
- زکوۃ کو ایک ٹیکس سمجھنا۔
- ٹیکس بچانے کی ہر ممکن کوشش کرنا اور اس کے لیے متعلقہ حکام کو رشوتیں دینا اور جعلی کھاتے بنانا
- اسراف یعنی بلاضرورت اور محض نام و نمود کی خاطر فضول خرچ کرنا۔
- فیشن پرستی
- اپنے قیمتی زرمبادلہ کے عوض مغرب سے اشیائے تعیش درآمد کرنا جیسے خواتین کی

افزائش حسن کے لوازمات، کاریں، بیڈ، منرل واٹر وغیرہ

- سمگلنگ کو جائز سمجھنا اور اس کے لیے شریعت سے دلائل گھڑنا اور اسے سادہ تجارت قرار دینا۔

بعض ناجائز پیشوں کی کراہت محسوس نہ کرنا

بہت سے پیشے ایسے ہیں جن کا ناجائز ہونا ہر مسلمان پر واضح ہے جیسے منشیات فروشی یا قحبہ گری۔ لیکن مغربی تہذیب کے زیر اثر ہمارے ہاں دوسرے بہت سے ایسے پیشے بھی وجود میں آ گئے ہیں جو ناجائز ہیں لیکن ان کی طرف ہمارا دھیان نہیں جاتا جیسے:

- سگریٹ ونسوار فروشی
- فحش فلموں، گندے ڈراموں اور واہیات گانوں کے کیسٹ اور سی ڈیز بیچنا
- فلموں، ڈراموں اور تھیٹر میں سوانگ رچانا یعنی ایکٹنگ کرنا
- ناچنے اور گانے کو بطور پیشہ اختیار کرنا
- مذکورہ بالا سرگرمیوں کی تشہیر اور اشاعت کرنا
- غیر تعمیری اور فحش گانے، فلمیں اور ڈرامے بنانا اور تھیٹر چلانا
- ویڈیو اور ٹی وی کے لیے فحش اور غیر تعمیری مواد لکھنا، لکھوانا اور اسے پیش کرنا
- اخبارات، جرائد اور کتب میں فحش اور غیر تعمیری مواد لکھنا، لکھوانا، چھپوانا اور تقسیم کرنا یا ایسا مواد امپورٹ کرنا وغیرہ
- بیوٹی پارلر چلانا
- ایکٹنگ، ڈانس اور گانا سکھانے کے لیے آرٹ اکیڈیمیاں چلانا

یہ محض مشتے نمونہ از خروارے ہے۔ اگر آپ باریک بینی سے جائزہ لیں تو آپ کو مزید کئی ایسے پیشے اپنے معاشرے میں نظر آئیں گے جو اپنی سپرٹ میں غیر اسلامی ہیں، مثلاً:

- مغربی و انڈین فلموں کے انداز میں ٹیکسٹائل و ڈریس ڈیزائننگ و اسچنگ یعنی

خواتین کے لیے ایسا کپڑا بنانا اور ایسے لباس ڈیزائن کرنا، سینا اور بیچنا جو ساتر نہ ہوں اور مسلم معاشرت کے تقاضوں کے خلاف ہوں۔

- حجام، جو مردوں کی داڑھی مونڈتے ہیں۔
- عورتوں کا سیلز گرلز کے طور پر کام کرنا
- سودی اداروں اور بنکوں کی ملازمت
- مخلوط تعلیم دینے والے تعلیمی ادارے قائم کرنا، چلانا ان میں پڑھانا اور اپنے بچوں کو وہاں تعلیم کے لیے بھجوانا
- سمگلنگ کا مال بیچنا
- محض زیادہ پیسوں کی خاطر مغربی ممالک میں جا کر ملازمت کرنا اور اپنا دین و ایمان خطرے میں ڈالنا
- ان کارخانوں میں کام کرنا جہاں ملاوٹ ہوتی ہے
- ایسے تعلیمی ادارے چلانا جہاں تعلیم و تربیت مغربی اصولوں پر ہوتی ہو۔
- ایسی ریکروٹنگ ایجنسیاں چلانا یا ان میں ملازمت کرنا جہاں لوگوں کو بغیر ویزے یا جعلی ویزے پر دوسرے ممالک بھجوایا جاتا ہے۔
- ریس کے گھوڑے پالنا، انہیں دوڑانا اور ان پر شرطیں لگانا
- اسقاط حمل کے کلینک چلانا
- پتنگوں کی دھاتی ڈوریں بنانا اور بیچنا
- کتے پالنا اور ان کی خرید و فروخت
- فوٹوگرافی کا پیشہ
- مشنری سکولوں اور اداروں کی ملازمت
- سود اور سٹے کا کاروبار کرنا
- جن لوگوں کے ذرائع آمدنی واضح طور پر ناجائز ہیں ان سے پیسے لے کر مسجدیں

اور مدرسے چلانا

- غیر معیاری لوازمے سے بنے ہوئے کھانے تیار کرنا اور بیچنا
- دودھ میں ملاوٹ کرنا اور اسے بیچنا
- غیر معیاری اجناس جیسے آٹا، مرچیں، نمک، ہلدی وغیرہ پیسنا اور بیچنا
- ایسی جگہ ملازمت کرنا جہاں آدمی رشوت لینے یا ظلم وستم کرنے سے نہ بچ سکے جیسے پولیس، محکمہ مال، ایکسائز وغیرہ۔
- ایسے محکموں کے ساتھ مل کر کام کرنا جہاں رشوت دیے بغیر کام کرنا ممکن ہی نہ ہو جیسے پی ڈبلیو ڈی کی ٹھیکیداری وغیرہ۔
- بنک، انشورنس کمپنیاں اور ایسے مالیاتی ادارے چلانا جن میں سود اور استحصال کا عنصر ہو۔
- ایسی تعمیراتی فرم چلانا یا اس میں ملازمت کرنا جو تعمیر میں غیر معیاری میٹریل استعمال کرتی ہو۔
- ایسی ہاؤسنگ اسکیمیں چلانا جن میں ایک پلاٹ کئی آدمیوں کو بیچ دیا جائے اور دیگر ہیرا پھیریاں ہوں۔
- پیری فقیری کا دھندا اپنا کر لوگوں کو لوٹنا
- عامل بن کر جادو وطلسم کا کاروبار کرنا

وغیر ذلک کثیر۔

معاشرت

گھروں میں عورتوں کی حکمرانی

جو فکر اور تہذیب عورت کے بارے میں متوازن رویہ اختیار نہ کرے وہ بالآخر تباہ ہو جاتی ہے۔ اسلام نے یہ توازن برقرار رکھا۔ پچھلی کچھ صدیوں سے مسلمان معاشرت

میں عورت کو وہ مقام حاصل نہیں رہا جو اسلام نے اسے دیا ہے مثلاً اسے وراثت میں سے حصہ نہ دینا، خاندان سے باہر شادی نہ کرنا، عورت کی بلاوجہ تحقیر کرنا، اسے حصول علم کا موقع نہ دینا، علمی و ادبی سرگرمیوں سے اسے محروم کرنا، دوسری شادی کو برا سمجھنا وغیرہ۔اس کے برعکس مغربی تہذیب دوسری انتہا پر چلی گئی اور عورتوں کو 'آزادی' اور 'حریت' کے نام پر معاشرت میں وہ مقام دے دیا جو فطری طور پر اس کا حق نہیں تھا۔اس سے ایک دوسری نوعیت کا بگاڑ پیدا ہو رہا ہے۔ہمارے ہاں اس کے کچھ مظاہر یہ ہیں:

- عورت کا شوقیہ ملازمت و تجارت کرنا
- خاوند جو کچھ کمائے اسے بیوی کی قانونی ملکیت بنا دینا
- کھانا پینا، پہننا، مکان بنانا، بچوں کے رشتے ناطے کرنا یہ سب عورت کے ہاتھ میں
- بیگمات کے خرچے پورے کرنے کے لیے شوہروں کا رشوت لینا اور دھوکہ فراڈ کرنا
- بیگمات کا سوشل اور فلاحی سرگرمیوں میں حصہ لینا، مخلوط اجلاسوں میں شریک ہونا
- گھروں میں مخلوط پارٹیاں دینا......وغیرہ
- مغربی لباس پہننے کو تفاخر کا سبب سمجھنا اور مقامی لباس کو حقیر سمجھنا

ایسا لباس پہننا جو جسم نہ چھپائے

اس کے تازہ ترین مظاہر یہ ہیں: مسلم روایت میں عورت کو ہاتھ پیر اور چہرے کے سوا باقی جسم کھلا رکھنے کی ممانعت ہے۔ہمارے ہاں پہلے عورتوں کی آدھی آستینوں کا رواج ہوا، تازہ فیشن یہ ہے کہ پوری آستین غائب اور قمیص اطراف سے اتنی اونچی کہ وہ رانوں کو نہ ڈھانکے اور شلوار کی موری اتنی تنگ اور اونچی کہ پنڈلیاں نمایاں ہوں اور نیچے سے ننگی۔ساڑھی میں جسم کا کچھ حصہ ننگا رکھنے کا فیشن تو تھا ہی اب عورتوں میں پینٹ شرٹ (خصوصاً جینز اور جوگر) پہننے کا رواج بھی پچھلے چند سالوں سے ترقی کر رہا ہے۔

اسی طرح برصغیر کے مسلمان مردوں میں انگریز کی نوکری کے زمانے سے پینٹ شرٹ اور سوٹ پہننے کا رواج تو تھا ہی، اب تازہ رواج یہ ہے کہ مرد نہ صرف گھروں

میں بنیان اور نیکر پہننے لگے ہیں بلکہ یہ پہن کر اب باہر کے کام بھی کرنے لگے ہیں۔

بال کٹوانا

- مردوں کے بال کٹوانے کے لیے مسلم روایت یہ تھی کہ بال چھوٹے رکھے جائیں یا بڑے ان میں یہ صورت نہ ہو کہ کہیں سے مونڈے جائیں اور کہیں سے نہ مونڈے جائیں۔ لیکن مغرب کی پیروی میں وہ فیشن آیا جسے 'بودے' یا 'بودی' کہا جاتا ہے یعنی نیچے سے قینچی یا مشین سے بال باریک کر دیے جائیں اور اوپر سے بڑے رہنے دیے جائیں اور کانوں کے قریب سے مونڈ دیے جائیں۔ اب پچھلے کچھ عرصے سے بچوں اور نوجوانوں میں یہ رواج چلا ہے کہ نیچے سے کافی اوپر تک بال یا تو بالکل مونڈ دیے جاتے ہیں یا باریک مشین سے بہت ہی چھوٹے کر دیے جاتے ہیں اور اس طرح فرمان نبوی کی خلاف ورزی کی جاتی ہے۔
- داڑھی مونڈنے کا گناہ اور فیشن اب اتنا پرانا اور مانوس ہو گیا ہے کہ اب گناہ ہی نہیں لگتا۔ نہ ہم نے کبھی سنا ہے کہ کوئی ایسا حجام ہو جو گناہ کا یہ کام کرنے سے انکار کرتا ہو۔
- عورتوں کا مردوں کی طرح بال کٹوانا خصوصاً شولڈر کٹ اور بوائے کٹ۔ پلکیں اور بھنویں بنوانا اور فیشل تو خیر ہر عورت اپنا حق سمجھتی ہے۔
- بغل اور زیر ناف بال کئی کئی ماہ تک نہ مونڈنا
- لباس اور وضع قطع میں مردوں کا عورتوں سے مشابہت اختیار کرنا (جیسے کانوں میں مندری اور ہاتھوں میں کڑے پہننا، بال بڑھانا وغیرہ) اور عورتوں کا مردوں کی مشابہت کرنا (جیسے پینٹ شرٹ، اور جوگرز پہننا، سگریٹ پینا، بال کٹوانا وغیرہ) اسی وجہ سے اقبال کو کہنا پڑا کہ

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں! جنہیں دیکھ کر شرمائیں یہود

عورتوں کا بن ٹھن کا باہر نکلنا

مسلم روایت میں عورت اپنے خاوند کے لیے بنتی سنورتی ہے اور اگر کہیں کسی ضرورت سے باہر جانا پڑے تو سادگی اختیار کرتی ہے۔ مغرب پرستی نے یہ روایت الٹ دی ہے۔ اب ہماری عورتیں جب گھر سے باہر جانے لگتی ہیں خصوصاً جب شاپنگ کے لیے بازار جاتی ہیں تو میک اپ ضروری سمجھتی ہیں اور بن ٹھن کر باہر جاتی ہیں یعنی گھر میں سادگی اور غیروں کے لیے بنتا سنورنا۔

عورتوں میں بے پردگی کی وبا

برقعے سے چادر تک کا سفر، پھر چادر کا سائز سکڑتا ہوا دوپٹا بن گیا اور کپڑا ململ کی طرح پتلا ہوتا چلا گیا۔ پھر دوپٹا بھی سر سے اتر کر کندھوں پر آیا اور بگل کی طرح آگے پیچھے سے ڈھانپنے کی بجائے رسی کی طرح اکٹھا کر کے صرف اگلی طرف تھوڑا سا پھیلا لیا گیا۔ پھر اس سے اگلی منزل آئی کہ صرف ایک کندھے پر لٹکا لیا جاتا ہے اور کچھ وہ خواتین بھی ہیں جو دوپٹے کا جھنجھٹ پالتی ہی نہیں اور اگر انہوں نے پینٹ شرٹ پہنی ہو، بال کٹے ہوں، ہونٹوں میں سگریٹ ہو تو بعض بچے اس پر شرط لگاتے دیکھے گئے ہیں کہ یہ عورت ہے یا مرد؟

اس موضوع پر اکبر الہ آبادی مرحوم کی رباعی اگرچہ پرانی ہو چکی لیکن مزیدار ہے، ایک دفعہ اور پڑھ لینے میں کیا حرج ہے؟

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا

پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا؟
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

مخلوط تعلیمی ادارے

یہ گناہ بھی اب پرانا ہو چکا اور نظریں اور دماغ اس سے اتنے مانوس ہو گئے ہیں کہ اب یہ گناہ لگتا ہی نہیں اگرچہ اس کے مفاسد روز افزوں ہیں۔ ناگفتنی اور ناجائز باتوں کے علاوہ اس کے کچھ ''جائز'' پہلو یہ سمجھے جاتے ہیں کہ استاد اپنی شاگرد سے نکاح کر لیتا ہے یا لڑکا لڑکی دوران تعلیم نکاح کر لیتے ہیں۔ ان دونوں باتوں کا نتیجہ عموماً زندگی میں سکون کے خاتمے کی صورت میں نکلتا ہے۔

شادیوں میں مخلوط تقریبات

پہلے شرفاء گھروں اور میرج ہالوں میں عورتوں اور مردوں کے الگ الگ بیٹھنے کا اہتمام کرتے تھے، اب اسے بھی دقیانوسیت سمجھ کر ترک کیا جا رہا ہے اور مخلوط محفلیں سکہ رائج الوقت بنتی جا رہی ہیں۔ یہ بھی دیکھنے میں آ رہا ہے کہ جس لڑکی کو عمر بھر پردے اور حیا کا سبق سکھایا جاتا ہے، اسے شادی والے روز مکمل میک اپ کے ساتھ سجا سنوار کر سیکڑوں ہزاروں غیر محرموں کے سامنے سٹیج پر بٹھا دیا جاتا ہے۔

شادی بیاہ کی مووی بنانا

اس گناہ کا شمار بھی اب ضروریات بلکہ 'ناگزیریات' (؟) میں ہونے لگا ہے اور شادی کے بعد اس کا وڈیو سارے عزیزوں میں گشت کرتا رہتا ہے۔

شادی کا فنکشن رات کے وقت رکھنا

لاہور اور بڑے شہروں میں یہ بھی فیشن بن گیا ہے کہ شادی کے فنکشن رات کے وقت رکھے جائیں۔ رات ایک بجے بارات آتی ہے اور تین بجے کھانا کھایا جاتا ہے۔ مایوں، مہندی، ولیمے وغیرہ کے فنکشن بھی رات کو ہوتے ہیں۔ رت جگا، نیند خراب، دن میں دفتر میں کام نہیں ہوتا، وقت بے وقت کھانے سے معدہ خراب، آتے جاتے ڈاکوؤں کا ڈر۔ اپنی سواری نہ ہو تو پبلک سواری کا انتظام یا خواری۔ اکثر لوگ شادی کی

ان تقریبات کے بعد بیمار ہوتے دیکھے گئے ہیں۔

مہنگی شادی

سفید پوش آدمی کے لیے اب بچے بچی کی شادی کرنا ایک گھمبیر معاشی مسئلہ بن گیا ہے کہ اس کے لیے لاکھوں روپے چاہئیں۔ جہیز کی تباہ کن رسم سے بچیوں کے بالوں میں سفیدی آ رہی ہے۔ نکاح اور رخصتی کی تقریب تو ایک طرف رہی اب تو منگنی اور مایوں پر لاکھوں اٹھتے ہیں۔ لوگ اس کے لیے ساری زندگی پیسے جوڑتے ہیں، مقروض ہو کر برسوں قرض اتارتے ہیں، ساری پنشن اس پر لگ جاتی ہے۔ ہم یہ سب کچھ جھیلتے ہیں لیکن یہ نہیں کر سکتے کہ شادی اور نکاح کی رسم مسلم روایت کے مطابق سادگی سے ادا کر لیں۔

شادی میں ناچ گانا

پہلے عورتیں اپنی مجلس میں کچھ اٹھکھیلیاں کر لیتی تھیں اور لڑکیاں گھروں کے اندر ڈھولک بجا لیتی تھیں یا نوابوں، جاگیرداروں وغیرہ کے ہاں شادی پر مجرے وغیرہ کی باتیں سننے میں آتی تھیں لیکن اب تو عام شادیوں میں سر راہ رشتہ دار مرد اور عورتیں ناچتی ہیں اور سب انہیں دیکھتے ہیں۔

کتے پالنے کا فیشن

چوری وغیرہ کے ڈر سے حفاظت کے لیے کتا پالنا الگ بات ہے، ہم مغربی تہذیب کی پیروی میں شوقیہ کتے پالنے کی بات کر رہے ہیں۔ اعلیٰ نسل کے کتے بھاری قیمت پر خریدے جاتے ہیں پھر اس کا تذکرہ محفلوں میں فخر سے کیا جاتا ہے۔ ان کے لیے ملازم رکھے جاتے ہیں، ان کی اعلیٰ خوراک اور گوشت وغیرہ کا انتظام کیا جاتا ہے ایک ایسے معاشرے میں جہاں لوگ بھوک سے خودکشیاں کر رہے ہوں بعض امیر لوگ انہیں ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں رکھتے ہیں، گاڑیوں میں ساتھ بٹھاتے ہیں، صبح شام انہیں

سیر کرانے کے لیے لے جاتے ہیں۔ کتوں کے مقابلۂ حسن کے لیے ڈاگ شو منعقد کیے جاتے ہیں۔ اخبارات میں ان کی خرید و فروخت کے اشتہار چھپتے ہیں......

لو میرج

ہم لاہور کی ایک متوسط درجے کی آبادی (علامہ اقبال ٹاؤن) میں رہتے ہیں اور ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ یہاں نوے فیصد شادیاں لو میرج کے طور پر انجام پا رہی ہیں۔ لڑکے لڑکی کے والدین عموماً اپنی عزت رکھنے کی خاطر مجبوراً خاموشی سے اس شادی کو قبول کر لیتے ہیں، اکا دکا واقعات عدالتوں میں بھی پہنچ جاتے ہیں جب نوجوان 'سول میرج' (؟) یا والدین سے پوچھے بغیر خفیہ شادی کر لیتے ہیں یا لڑکے لڑکی کے گھر سے بھاگ جانے کی صورت میں والدین تھانوں کچہریوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ لڑکے لڑکی کے والدین عموماً اس صورت حال کو خوش دلی سے قبول نہیں کرتے۔ اس سے جو معاشرتی بے چینی پیدا ہو رہی ہے وہ کبھی کبھار قتل و غارت گری کی شکل بھی اختیار کر لیتی ہے۔

ٹی وی

ٹی وی نے ہماری معاشرتی قدروں کو تباہ کر دیا ہے۔ پہلے دن بھر کے کام کاج کے بعد شام کو مرد عموماً چوپالوں، بیٹھکوں، پارکوں اور باغیچوں میں جا بیٹھتے تھے اور عورتیں محلے میں ایک دوسرے کے ہاں جا بیٹھتی تھیں۔ لوگ ایک دوسرے کی سنتے سناتے تھے، کچھ گپ شپ ہوتی تھی، انفرادی مسائل پہ مشورے ہو جاتے تھے اور ایک اجتماعی کتھارسس کی صورت بنتی تھی۔ لوگ ایک دوسرے سے مربوط اور ایک دوسرے کی خوشی اور غم میں شریک ہوتے تھے اور یوں اخوت اور بھائی چارے کا احساس ہوتا تھا۔ ٹی وی آیا تو یہ سارے سلسلے موقوف ہو گئے۔ اب عورتیں، مرد اور بچے شام کو فارغ ہوتے ہیں تو ٹی وی کھول کر بیٹھ جاتے ہیں اور فلمیں اور ڈرامے دیکھتے ہیں۔

انٹرنیٹ

انٹرنیٹ کی فحش ویب سائٹس اور چیٹنگ نے نوجوانوں کے لیے فحاشی اور بے راہ روی کے دروازے چوپٹ کھول دیے ہیں۔ کمپیوٹر کی تعلیم اب بڑے شہروں سے قصبات تک پہنچ چکی ہے۔ بچے آسانی سے والدین کو یہ کہہ کر چکمہ دیتے ہیں کہ ہم پریکٹس کر رہے ہیں (یعنی اپنا تعلیمی کام کر رہے ہیں) جبکہ وہ جو چاہتے ہیں وہ دیکھتے ہیں۔

انٹرنیٹ کیفے اور سی ڈی شاپس

بجائے اس کے کہ قوم انفارمیشن ٹیکنالوجی سے کوئی بڑا کام لیتی، صحیح رہنمائی اور جذبے سے محرومی کے نتیجے میں عام لوگ کمپوزنگ سیکھ کر کلرکی کرنے یا کمپیوٹر مرمت کرنے والے ٹیکنیشن بننے پر کفایت کرتے ہیں۔ نوجوان محلے محلے کھلنے والے انٹرنیٹ کیفوں پر جا کر غیر تعمیری سرگرمیوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ پہلے ہر جگہ وڈیو شاپس کھلی تھیں جہاں سے لوگ انڈین اور انگریزی فلموں کے وڈیو کیسٹس لا کر دیکھتے تھے۔ جن غریبوں کے پاس ٹی وی نہ ہوتا تھا وہ اسے کرائے پر لے آتے تھے۔ اب وڈیوز کی جگہ سی ڈی نے لی ہے جو جیب یا کتاب، رسالے میں رکھ کر مزید آسانی سے گھر لائی جا سکتی ہے اور والدین کو پتہ بھی نہیں چلتا۔

ویلنٹائن ڈے

یہ مغربی تہذیب سے درآمد کردہ ایک تازہ لعنت ہے کہ یوم محبت منایا جائے اور نوجوان لڑکے لڑکیوں کو کھلے عام محبت کرنے کا لائسنس دیا جائے، چنانچہ نوجوان اپنے پیغامات اخبارات میں شائع کرواتے ہیں، سرخ گلاب کے گلدستے بھجواتے اور پیش کرتے ہیں۔ بڑے شہروں کے پوش علاقوں میں Dating بھی شروع ہو گئی ہے۔

بسنت

ہندو ثقافت کا مظہر یہ پروگرام پچھلے چند سالوں سے پاکستان میں بہت دھوم دھام

سے منایا جاتا ہے۔ اس کے پیچھے وہ عناصر ہیں جو ہندو ثقافت اور مغربی تہذیب کے دلدادہ ہیں۔ شور شرابہ، ہلا گلا، پینے پلانے اور ناچنے گانے کی مخلوط مجلسیں سجانا، بسنتی کارڈ بھیجنا، مخصوص لباس پہننا، ہوٹلوں کی چھتیں بک کرواتا وغیرہ اس شو کا لازمی حصہ ہیں۔ حکومت چونکہ دباؤ میں ہے (اور وہ اس لیے دباؤ میں ہے کہ وہ دباؤ قبول کرتی ہے) اس لیے وہ اپنے آپ کو معتدل اور روشن خیال ظاہری کرتی ہے اور اپنا سافٹ امیج ابھارنا چاہتی ہے۔ اس لیے وہ بسنت کے پروگرام کی حوصلہ افزائی کرتی ہے اور اسے اس بات کی بھی پروا نہیں کہ اس سے کتنے لوگوں کے گلے کٹتے ہیں، کتنے پتنگ لوٹتے ہوئے مرتے ہیں۔ کتنے کروڑ کا نقصان محکمہ بجلی کو ہوتا ہے اور بجلی کی بار بار ٹرپنگ اور پانی و بجلی کی عدم فراہمی سے کتنا نقصان عوام کا ہوتا ہے اور انہیں کتنی کوفت اور تکلیف ہوتی ہے۔

میراتھن ریس

یہ ایک نئی مصیبت ہے جو مغرب کی نظر میں سافٹ امیج ابھارنے کی شوقین حکومت نے اپنے لیے کھڑی کر لی ہے۔ مدعا اس کا یہ ہے کہ ایک دن مقرر کر کے لڑکے لڑکیوں کو (نامناسب لباس میں) سڑکوں پر دوڑایا جائے۔

ظاہر ہے کوئی دین اور معاشرہ نوجوانوں کی صحت مند تفریح کی مخالفت نہیں کرتا لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ اس کے لیے اپنی معاشرتی قدروں کا مذاق اڑایا جائے۔ مسلم معاشرت میں نوجوان لڑکیوں کے نامناسب لباس میں سڑکوں پر دوڑنے کا کوئی تصور نہیں لہٰذا عوام اسے ناپسند کرتے ہیں۔ لیکن بے راہ روی کی علمبردار حکومت اپنی ساری قوت اور وسائل اس پروگرام کو کامیاب بنانے پر لگا دیتی ہے جس کا کوئی جواز نہیں۔

پاپ میوزک

مغرب سے پاپ میوزک درآمد کیا گیا ہے اور مسلمان نوجوان گلوکار بے ہنگم طریقے سے ٹھمکتے، ناچتے اور بے سرا گاتے ہیں، ساتھ چیختی چنگھاڑتی موسیقی ہوتی ہے۔

نوجوان گلوکاروں نے اس کارخیر کے لیے گروپ بنالیے ہیں، ان کے مزاج اور کام کی عکاسی ان کے نام ہی سے بخوبی ہو جاتی ہے، جیسے جنون گروپ۔

تعلیمی اداروں کے فیشن شوز

مغرب سے متاثر تعلیمی اداروں کے سربراہوں نے سوچا کہ وہ اس کارخیر میں کیوں پیچھے رہیں۔ چنانچہ انہوں نے سالانہ فنکشن کے موقع پر ناچنے گانے والوں ر والیوں کو بلانا شروع کردیا۔ سکولوں کالجوں کی لڑکیوں سے بھی ڈانس کروایا اور گانے گوائے جاتے ہیں، ڈرامے کروائے جاتے ہیں۔ شریف لوگ 'ٹیبلو' اور 'ملی نغموں' سے اس کسک کو پورا کرلیتے ہیں۔

میوزک اور سوئمنگ پول

بڑے شہروں کے بہت سے سکولوں میں اب میوزک کا پریڈ ہوتا ہے اور یوں موسیقی کی تعلیم جزو نصاب بن گئی ہے۔ 'اعلیٰ' اور 'ٹاپ' کے سکولوں میں جہاں سالانہ فیس ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں ہوتی ہے، سوئمنگ پول کا بھی اہتمام ہوتا ہے۔ ہمارے ایک جاننے والے نے ایک لاہوری سکول سے اپنی نوجوان بچیاں اس لیے اٹھا لیں کہ سکول ان کو سوئمنگ سے آف دینے کو تیار نہ تھا بلکہ الٹا اس ماڈرن سکول کی پرنسپل نے ان صاحب کی بے عزتی کی کہ آپ اتنے دقیانوسی تھے تو ہمارے سکول میں بچیاں داخل کیوں کروائی تھیں؟

بیوٹی پارلرز

شہروں میں یہ ایک نیا کاروبار پچھلے چند سالوں سے فروغ پذیر ہے۔ جس میں عورتوں کے صرف بال ہی نہیں کاٹے جاتے بلکہ انہیں حسین تر بنانے کے لیے اور بھی بہت کچھ کیا جاتا ہے جو صحیح احادیث کی رو سے صریح معصیت کا کام ہے۔

کاسمیٹک سرجری اور لیزر سنٹرز

بلکہ اب تو پاکستان کے بڑے شہروں میں کاسمیٹک سرجری اور لیزر سنٹرز بھی عام ہورہے ہیں جہاں خواتین کی افزائش حسن کے لیے ماہر سرجن جدید ترین ٹیکنالوجی سے آراستہ مراکز کھولے بیٹھے ہیں اور جہاں ناپسندیدہ بالوں کا مستقل خاتمہ، نسوانی ابھاروں کی کمی بیشی، ہونٹ اور ناک پتلے کروانے، اور کیل مہاسے کے خاتمے ...... وغیرہ کے لیے خدمات 'ارزاں نرخوں' پر مہیا کی جاتی ہیں۔

ہوٹلنگ

کھاتے پیتے شہری لوگوں میں ہوٹلنگ ایک فیشن بلکہ مرض بنتی چلی جارہی ہے یعنی گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ ہے، پکانے کے لیے نوکر موجود ہیں لیکن فائیو سٹار ہوٹل یا نامی گرامی ریسٹورنٹ میں جا کر کھانے کے اپنے مزے اور اپنی ''ٹوہر'' ہے۔

سیلز گرلز

بڑے شہروں کی پوش مارکیٹوں میں اب سیلز گرلز بھی آنا شروع ہوگئی ہیں اور روزمرہ استعمال کی اشیاء (کنزیومر گڈز) کے سیلز پروموشن کے شعبوں نے لڑکیوں کو گھر گھر بھی بھجوانا شروع کر دیا ہے جس کا نظارہ اب بڑے شہروں کے محلوں میں عام ہے۔

شہروں کی بڑھتی آبادی

شہروں میں تعلیم اور .گار وغیرہ کے مواقع چونکہ زیادہ ہیں اور دیہاتوں میں یہ سہولتیں مقابلتاً کم ہیں، اس لیے لوگ دھڑا دھڑ بڑے شہروں کا رخ کر رہے ہیں اور ہمارے شہر بے ہنگم طریقے سے پھیلتے جارہے ہیں اور کوئی نہیں جو اس کا سد باب کرے یا اس کی پلاننگ کرنے کا سوچے۔

آرٹ اکیڈیمیاں

یہ اکیڈیمیاں ڈانس سکھاتی ہیں، ایکٹنگ سکھاتی ہیں اور گانے کی تربیت

دیتی ہیں۔

''شہر کی تے مہر کی''

یہ ایک پنجابی ضرب المثل ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ شہر میں کسی کی نمبرداری نہیں چلتی۔ یہ ایک سمبل ہے کہ ہمارے بڑے شہروں کی معاشرت اب ہماری روایتی مشرقی اور اسلامی معاشرت نہیں رہی۔ اب ہمارے شہروں میں ایک دوسرے سے لاتعلقی کے مظاہر عام ہیں۔ لوگ ایک دوسرے کو جانتے نہیں، ایک دسرے کے غم یا خوشی میں شریک نہیں ہوتے۔ اخوت اور بھائی چارے کا کوئی تصور نہیں رہا۔ ہر شخص پر گویا لاتعلقی اور بے حسی طاری ہے۔ خود غرضی کا ماحول ہے اور کوئی کسی کا پرسان حال نہیں۔

اولڈ ہومز

ہمارے بڑے شہروں میں مخیّر اور نیک حضرات نے اولڈ ہومز بنوانے شروع کردیے ہیں جہاں بوڑھے لوگ پناہ لیتے ہیں کیونکہ مغرب کی تقلید میں اب اولاد بوڑھے والدین کی پروا نہیں کرتی۔ بوڑھے لوگ بیکار اور بوجھ سمجھے جاتے ہیں۔ اسلام کا مثالی خاندانی نظام بکھرنا شروع ہو گیا ہے اور بوڑھے والدین کسمپرسی کا شکار ہونے لگے ہیں۔

ظاہر داری اور ریا

اس کے بے شمار مظاہر ہمارے معاشرے میں پھیلتے جا رہے ہیں مثلاً:

- قسطوں پر فرج، ٹی وی، کار اور فلیٹ وغیرہ خریدنا۔
- قرض لے کر دھوم دھام سے شادی کرنا۔
- کشادہ دستی نہ ہونے کے باوجود خوب بن سنور کر باہر نکلنا
- مظاہر امارت میں دوسروں سے مسابقت کرنا
- بڑے بڑے محل نما مکان بنانا

- ڈرائنگ روم بڑے اور کھلے رکھنا اور انہیں خوب بنا سجا کر رکھنا
- کار کے ماڈل بدلتے رہنا......وغیرہ۔

نوجوانوں کے بعض مشاغل

- گلی کی نکڑ پہ کھڑے رہنا
- چھٹی کے وقت لڑکیوں کے سکولوں کالجوں کے سامنے کھڑے ہونا
- کار اور گھر میں اونچی آواز سے ڈیک چلانا
- مخلوط پکنک پارٹیاں
- چاندرات چوڑیاں خریدنے اور مہندی لگوانے بازار جانا
- گمنام فون کالیں کرنا۔
- کرکٹ اور دوسری کھیلوں کا کریز اور جنون
- لوفرانہ انداز میں سگریٹ پینا
- بے تکے بال بڑھانا اور کانوں میں مندری پہننا
- بن سنور کر بازار جانا......وغیرہ۔

ثقافت

فحاشی وعریانی

کوئی بھی تہذیب اور ثقافت آرٹ (فنون لطیفہ) کا انکار نہیں کرتی، تاہم ان کا تعین وہ اپنے عقائد اور نظریۂ حیات کے مطابق کرتی ہے۔ مغربی فکر وتہذیب کا مرکزی نقطہ چونکہ یہ ہے کہ انسان اپنا خدا خود ہے اور مختار مطلق ہے اور کسی خدا و رسول کی غلامی اس کو سزاوار نہیں لہٰذا وہ زندگی اپنی مرضی اور اپنی خواہشات کے مطابق بسر کرے گا۔ چنانچہ اس نظریۂ حیات کے مطابق شیطان اور نفس امارہ کو کھل کھیلنے کا موقع ملتا ہے اور جنس پرستی اور لذت کوشی ایک باقاعدہ فلسفہ بن کر سامنے

آتے ہیں۔ یوں عریانی اور فحاشی ان کے نزدیک فرد کا پرائیویٹ معاملہ، اس کا حق اور اس کی مرضی ہے اور جو وہ کرے سب جائز ہے۔

مسلمانوں کی فکر، اس کے برعکس نہ تو فرد کو خدا سمجھتی ہے اور نہ اسے اپنی ہر حیوانی خواہش پوری کرنے اور اپنی ہر مرضی پر عمل کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے مسلم معاشروں کی قیادت ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو ہر معاملے میں آنکھیں بند کر کے مغرب کی پیروی کو ترقی کی معراج سمجھتے ہیں چنانچہ ''روشن خیالی'' اور ''ترقی'' کا مظاہرہ کرتے ہوئے مغرب کی فلمیں، ڈرامے اور تفریحی پروگرام وہ اپنے ریڈیو ٹی وی سے نشر کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ یوں مسلمان قوم کے اخلاق برباد کیے جا رہے ہیں اور ان کے عقائد و نظریۂ حیات کے برعکس مغربی ثقافتی پالیسی مسلمان ملکوں پر نافذ اور مسلط کی جا رہی ہے۔

عورت برائے لذت و کاروبار

مغرب سے مرعوب اذہان اور اس کی اندھی پیروی کرنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ مغرب ہر فیلڈ میں کامیاب ہے اس لیے اس کی ثقافتی پالیسی بھی صحیح اور کامیاب ہے اور ہمیں اپنی دقیانوسیت اور پرانی پسماندہ عادتیں چھوڑ کر اس ثقافتی پالیسی کو اپنا لینا چاہیے حالانکہ یہ نقطۂ نظر سراسر غلط ہے۔ مغرب نے ترقی اس لیے نہیں کی کہ اس کی ثقافتی پالیسی دوسروں سے برتر ہے بلکہ اس لیے ترقی کی ہے کہ وہ اپنے نظریۂ حیات سے، جیسا بھی وہ ہے، کمٹڈ (committed) ہے، اس کے لیے قربانی دے سکتا ہے، گردن کٹوا سکتا ہے، اپنا مال خرچ کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ نظم و ضبط، قانون کی پابندی، محنت، ریسرچ، تعلیم و تربیت، میڈیا، معاشی و سیاسی استحکام اور سائنس و ٹیکنالوجی اس کی ترقی کا سبب ہیں نیز ان کی ثقافتی اور معاشرتی پالیسی مثلاً شراب نوشی، رضامندی سے زنا کی اجازت، ہم جنس پرستی کو مباح ٹھہرانا، عریانی، نکاح کے بغیر میاں بیوی کی زندگی گزارنے کی اجازت اور خاندان کے ادارے کا خاتمہ، یہ ان کی زندگی کے کمزور پہلو ہیں اور وہاں کے سنجیدہ مفکرین ان کو برابر متنبہ کر رہے ہیں کہ یہ تہذیبی خودکشی ہے لیکن مادر پدر آزادی کا جو جن بوتل سے باہر آ چکا ہے اب اسے دوبارہ بوتل میں بند کرنا

خود ان کے لیے ممکن نہیں ہے اور اب یہ انہیں ڈبو کر ہی رہے گا۔

اس کے برعکس مسلم نظریۂ حیات نہ اس مادر پدر آزادی کا قائل ہے اور نہ وہ عورت کو آلۂ لذت و کاروبار سمجھتا ہے بلکہ وہ عورت کی عزت و تکریم کرتا ہے، اسے نسل انسانی کی افزائش اور نئی نسل کی تربیت کی ذمہ داری سونپتا ہے۔ گھر چلانے کی ذمہ داری بھی اس کے سپرد ہے۔ اسلام اسے سچ مچ "عورت" سمجھتا ہے۔ عورۃ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں پوشیدہ چیز جو ظاہر اور نمایاں نہ ہو۔ گویا اسلام میں عورت شمع محفل نہیں، گھر کی ملکہ ہے۔ اس کا کام بازار اور فلم و ڈرامے کی سٹیج نہیں گھر کی خلوت ہے۔ نیز وہ اسے عفت و عصمت کا درس دیتا ہے۔ بدقسمت ہیں وہ مسلمان جو مغرب کی پیروی کی ترنگ میں مسلما بہنوں اور بہو بیٹیوں کو محض سامان لذت اور آلۂ کاروبار سمجھتے ہیں۔

شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر

مسلم نقطۂ نظر کی ترجمانی اقبال نے یوں کی ہے کہ۔

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر

لیکن مغرب کے اندھے مقلدوں کو شیطان اور نفس حیوانی یہ سوچنے کا موقع نہیں دیتا کہ جو قوم اور تہذیب "طاؤس و رباب اول" اور "شمشیر و سناں آخر" کے اصول پر عمل کرتی ہے وہ اپنے جینے کا استحقاق کھو دیتی ہے۔ مغرب کا طاؤس و رباب اس لیے چل رہا ہے کہ وہاں آج بھی شمشیر و سناں اول ہے۔ سارے عالم اسلام کا دفاعی بجٹ ملا لیا جائے تو وہ اتنا نہیں بنتا جتنا اکیلے امریکہ کا دفاعی بجٹ ہے۔ امریکہ کے پاس جتنا ایٹمی اور تباہ کن اسلحہ ہے سارا عالم اسلام اس کے پاسنگ بھی نہیں اور امریکہ اسے چند منٹ میں ملیا میٹ کر سکتا ہے اور مسلمان ممالک اس کا معمولی جواب دینے کی اہلیت بھی نہیں رکھتے لہٰذا خواتینِ مغرب کی ننگی پنڈلیوں اور تھرکتے جسموں کو "روشن خیالی" اور "ترقی" کی معراج سمجھنے والے جنت الحمقاء میں بستے ہیں۔

تصویر کا جمال

غالباً اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ مغرب کی مادہ پرست فکر کا جمالیاتی ذوق Content کی بجائے Form اور داخلیت کی بجائے خارجیت کو ترجیح دیتا ہے۔ اس تصور نے مغرب میں تصویر کو پاپولر کر دیا ہے۔ فلم، ڈرامے، ٹی وی، انٹرنیٹ، سب کہیں تصویر اور خصوصاً عورت کی۔ اس کے برعکس اسلام کا تصور جمال نفاست، شائستگی، سادگی اور پاکیزگی کا مظہر ہے۔ ایک دفعہ سفر میں ایک صحابی 'ہدی' گا رہے تھے۔ سردار دو جہاں (ﷺ) نے اسے گانے سے منع نہیں کیا لیکن یہ تنبیہ کرنا ضروری سمجھا کہ ذرا سوچ سنبھل کے، کہ خواتین بھی ساتھ ہیں اور سن رہی ہیں۔ (۱)

فلمیں اور ڈرامے

فلم اور ڈرامے کی کثرت اور مقبولیت مغرب کی ایجاد ہے اور یہ اسی کی فکر اور تہذیب کے مظہر ہیں اور ہمیں اس چیز کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ یہ ہماری تہذیب و ثقافت میں اجنبی پیوند ہیں جنہیں اسلام کی جمالیاتی اور ثقافتی روح قبول نہیں کرتی۔ ہمیں یہ سوچنے کا موقع بھی نہیں ملتا کہ ہماری چودہ سو سالہ تہذیب اس فلم اور ڈرامے سے آخر خالی کیوں ہے؟ اور یہ کہ اس کی وجہ ہماری پسماندگی اور مُلّا کی تنگ نظری نہیں بلکہ اسلام کی جمالیاتی حس ان سے اِبا کرتی ہے۔ ہمیں تو یہ سوچنے کی توفیق بھی نہیں ہوتی کہ ہر سوانگ رچانے والا ایکٹر اپنا سوانگ بھول جاتا ہے اور ہر رنگ کو قبول کرنے والا 'اداکار' اپنا رنگ کھو دیتا ہے۔ رومانویت بلاشبہ زندگی کا ایک حصہ ہے لیکن حدود و قیود کے ساتھ اور یہ زندگی کا جزو ہی ہے، کُل نہیں لہٰذا بچوں اور نوجوانوں کے لیے مار دھاڑ، قتل و غارت اور ننگے تھرکتے جسموں کی بہار تباہ کن ثابت ہوتی ہے اور انہیں تخریبی راستوں کا راہی بنا دیتی ہے۔ لیکن یہ فکر تو تب ہو

۱۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب رحمۃ النساء وأمرہ الرفق بھن

جب 'تعمیر' اور 'تخریب' کا فرق کسی کو معلوم ہو اور رسول معظم (ﷺ) کا یہ ارشاد بھی سامنے ہو کہ 'دنیا [تمہاری] آخرت کی کھیتی ہے' (۲) لہٰذا ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہم اپنے نوجوانوں کے ذہنوں میں کیا ''بو'' رہے ہیں؟

سٹارز اور فنکار

مسلم معاشرت میں گانے، بجانے، ناچنے اور سوانگ بھرنے والے لوگ تحقیر سے میراثی، بھانڈ، گویے، مخنث، مخنچے، رنڈیاں اور طوائف کہلاتے تھے، مغرب کی تہذیب نے انہیں معزز ''فنکار'' بنا دیا ہے۔ اب یہ ایک قابل احترام پیشہ ہے۔ اور 'پیشہ' کا اردو لفظ بھی اس کے لیے غیر موزوں ہے۔ اب تو یہ ایک معزز پروفیشن ہے اور اب فنکار یہاں صرف ''اُس بازار'' سے نہیں آتے بلکہ اچھے بھلے، پڑھے لکھے اور کھاتے پیتے شریف گھرانوں کی لڑکیاں 'آرٹ اکیڈیمیوں' سے فارغ التحصیل ہو کر اس پروفیشن کی تربیت پا کر اس معزز پروفیشن میں آتی ہیں اور یہی نہیں انہیں اتنی زیادہ عزت و تکریم دی جاتی ہے گویا وہ آسمان کے ستارے ہوں چنانچہ فلموں ڈراموں میں حصہ لینے والوں کو سٹارز (ستارے) کہا جاتا ہے۔

یہ ہے مغربی تہذیب کا جادو کہ مسلم تہذیب میں جو عنصر معاشرے کی تلچھٹ تھا، جن کے ہاں جانے کے لیے بگڑے نوجوان منہ ڈھانپ کر جاتے تھے کہ کوئی انہیں دیکھ اور پہچان نہ لے اور ان کے خاندان کو بٹہ نہ لگے، وہ گانے اور ناچنے والے اب سروں کا تاج، معزز فنکار اور سٹارز بن گئے ہیں یہاں تک کہ وزراء اور اعلیٰ عدلیہ کے جسٹس صاحبان تقریبات میں جا کر انہیں تاج پہناتے ہیں۔ تفو برتو اے چرخ گردوں تفو!

رقص اور دھمال

- ''رقص میں کیا برائی ہے یہ تو محض ایک فیشن ہے؟''

۱۔ العجلونی، کشف الخفا، ج ا، ص ۴۹۵، مکتبہ دار التراث، بیروت۔ یہ حدیث سند کے لحاظ سے ضعیف ہے لیکن قرآن وسنت سے تائید کی وجہ سے اس کا مفہوم صحیح ہے۔

سچ کہا، یہ ایک فیشن ہے لیکن مغرب کا، مسلمانوں کا نہیں

- ''یہ مولوی لوگ تو حسن جمال سے عاری ہیں! رقص کیا ہے محض اعضاء کی شاعری!''

ٹھیک! رقص واقعی اعضاء کی شاعری ہے لیکن اس 'شاعری' سے جو سفلی جذبات بھڑکتے ہیں اور جو آخری نتیجہ نکلتا ہے وہ مغرب کو قابل قبول ہے، مسلمانوں کو نہیں کیونکہ ان کا دین ان کو حیا، عفت، عصمت اور پاکیزگیٔ فکر و نظر کا درس دیتا ہے اور اس آخری نتیجے کے ایکٹروں کو کوڑے اور پتھر مارتا ہے۔

- ''صوفیوں کا رقص (دھمال) ایک پاکیزہ فطری جذبے کا اظہار ہے، وہ ناچ کر اپنے اللہ، اپنے محبوب کو مناتے ہیں''۔

لیکن اکثر وہی صوفی ایسا کرتے ہیں جو بھنگ پیتے اور چرس کے کش لگاتے ہیں اور جن کا تصوف ہندو مذہب سے متاثر ہے جس میں ناچ گانا مذہب کا ایک حصہ اور کار ثواب ہے۔ قرآن و سنت اور سچے مسلمان صلحاء اور صوفیاء (جیسے حضرت حسن بصریؒ، حضرت سفیان ثوریؒ، حضرت جنید بسطامیؒ، حضرت علی ہجویریؒ، حضرت خواجہ اجمیریؒ وغیرہ) سے ایسے رقص کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔

گانا اور قوالی

''متشدد اور تنگ نظر مولوی ہر قسم کے گانے کو برا سمجھتے ہیں حالانکہ سرور عالم (ﷺ) نے خود گانا سنا ہے اور اپنے گھر والوں کو بھی سنوایا ہے''۔

ٹھیک فرمایا! گانے کا مواد اگر تعمیری ہو، آلات موسیقی استعمال نہ کیے جائیں اور گانے والا غیر پیشہ ور مرد ہو تو ایسا گانا سننے میں کوئی حرج نہیں لیکن مغرب نے جو گانا ہمارے ہاں مروج فرمایا ہے اس کے کچھ اطوار ملاحظہ ہوں:

۱۔ عموماً غیر محرم اور پیشہ ور عورتیں گاتی ہیں، جو عریانی کا شاہکار ہوتی ہیں۔

۲۔ وہ ساتھ اعضاء کی شاعری بھی کرتی ہیں۔

۳۔ گانے کا مواد بھی عموماً سفلی جذبات کو بھڑکانے والا ہوتا ہے۔

۴۔ اس میں پیچیدہ آلات موسیقی استعمال ہوتے ہیں جو جوش کو جنوں میں بدل ڈالتے ہیں۔

۵۔ ناچ گانے کے یہ شائقین بالعموم پینے پلانے کا شغل بھی ساتھ جاری رکھتے ہیں۔

اس گانے کے نتائج ظاہر ہیں اور یہ اندازہ لگانا بھی دشوار نہیں کہ اس کی موجودگی میں پاکیزگیٔ فکر ونظر کا کیا حال ہوتا ہوگا؟ پھر جس اباحت کی لوگ مثال دیتے ہیں وہاں گانا یا تو اونٹوں گھوڑوں کے پر مشقت سفر کی کلفت دُور کرنے کے لیے گایا جاتا تھا یا شادی اور عید وغیرہ کی تقریب پر۔ اس کو گانا سننے کے اس جنون کی کیفیت پر قیاس نہیں کیا جا سکتا جو مغرب نے ہم پر طاری کر دیا ہے کہ دفتر میں سارا دن موسیقی بجتی ہے، گھروں میں والدین یا ہمسائے منع کریں تو نوجوان واک مین لگا لیتے ہیں، بلکہ ہم نے تو یہاں تک دیکھا ہے کہ نوجوان باتھ روم بھی واک مین پہنے ہوئے جاتے ہیں اور ساتھ گانے کی دھن پر تھرک بھی رہے ہوتے ہیں۔ گھروں، دکانوں، بسوں، ویگنوں، ہوائی جہازوں اور کاروں میں موسیقی سننے کا اہتمام ہوتا ہے۔ موسیقی اور گانا سننے کی یہ کیفیت کس اسلامی حکم اور مسلم ذوق جمال کی رُو سے جائز اور تعمیری ہے؟

قوالی! جی ہاں قوالی؟ بعض لوگ اس کا لکھنا، گانا اور سننا کار ثواب سمجھتے ہیں! ظاہر ہے جب یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں نے راگ، موسیقی اور گانے کو اپنے مذہب اور مراسم عبودیت کا جزو بنا لیا ہے تو مسلمان کیوں پیچھے رہتے؟ چنانچہ انہوں نے پہلے ''نعت شریف'' اور ''درود شریف'' کو مسجد کے اندر کھڑے ہو کر اور ہاتھ باندھ کر گانا شروع کیا اور پھر پیشہ ور گانے والے (قوال) میدان میں آ گئے، جنہوں نے ہر قسم کے آلات موسیقی کے ساتھ، تالیوں کے ساتھ، اور فلمی دھنوں میں صوفیوں کے مزارات وغیرہ پر صوفیانہ کلام گانا شروع کیا اور یار لوگوں نے اسے بھی مذہبی تقدس کا رنگ دے دیا جس میں ''معرفت'' کے نام پر ہر قسم کی شرکیہ اور

واہیات چیزیں گائی جاتی ہیں۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا سازوں کے ساتھ غیر محفوظ کلام، معاوضے کے عوض، پیشہ ور گانے والیوں/والوں سے مخلوط مجالس میں سننا، اس کی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں اور نہ اس میں کوئی مذہبی تقدس ہے لیکن جن شروط کا ہم نے ذکر کیا، ان کی پابندی کے ساتھ گانا گایا بھی جاسکتا ہے اور سنا بھی جاسکتا ہے۔

کھیل

کھیلوں کا جنون

مختلف قسم کے کھیلوں میں حصہ لینا بچوں اور نوجوانوں کے لیے بالکل فطری ہے اور اسلام جو دین فطرت ہے اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے لیکن کھیلنے اور کھیل دیکھنے کو جنون بنالینا غیر صحت مندر رجحان ہے۔ کرکٹ ہو رہا ہو تو لوگ دفتر نہیں جاتے، ٹی وی کے آگے سے نہیں ہٹتے، نہ کھانے کی ہوش نہ نماز روزے کی، نہ نماز با جماعت کی، نظریں ٹی وی سے ہٹتی ہی نہیں۔ اور اگر ٹیم جیت جائے تو لوگ ہاؤ ہو کرتے اور شور مچاتے گلیوں میں نکل آتے ہیں اور ہار جائے تو مغموم ہو کر اپنے اوپر ڈیپریشن طاری کر لیتے ہیں اور بعض تو دل کے دورے میں شہید کرکٹ ہو جاتے ہیں۔ الامان!

کئی کئی دن کی کرکٹ

تفریح، تفریح ہی رہے تو جچتی ہے لیکن اسے وظیفۂ حیات نہیں بنانا چاہیے۔ دن میں گھنٹہ دو گھنٹہ کھیل لیا، ٹھیک ہے لیکن کئی کئی دن کی کرکٹ کا کیا جواز ہے؟ ساری قوم سارے کام چھوڑ کر ٹیسٹ میچ دیکھ رہی ہوتی ہے، یہ کیا مصیبت ہے؟

کھلاڑیوں کو ہیرو سمجھنا اور آئیڈیالائز کرنا

کھیلوں کا ایسا ماحول بنایا جاتا ہے (ٹی وی پر دکھانا، اخبارات، خصوصی جرائد، سی ڈیز، کھیلوں کے خصوصی چینلو) کہ نوجوان لڑکے اور خصوصاً لڑکیاں کرکٹ کے نوجوان

اور خوبصورت کھلاڑیوں کو آئیڈیلائز کرنے لگتی ہیں، انہیں ہیرو سمجھتی ہیں۔ ان کے بڑے بڑے پوسٹر کمرے میں لگائے جاتے ہیں، چھوٹے سائز کے فوٹو پرسوں اور جیبوں میں رکھے اور کاپیوں پر سجائے جاتے ہیں، وہ محفلوں میں موضوع بحث بنتے ہیں، ان کے دستخط لیے جاتے ہیں، مسلمان لڑکیاں سٹیڈیم جا کر میچ دیکھتیں اچھلتی ،کودتی ،شور کرتی ،پوز بنواتی اور ہوائی بوسے ارسال کرتی ہیں۔ یہ سب کچھ اس کھلاڑی کے لیے ہوتا ہے، جس کا عموماً کوئی کردار نہیں ہوتا، بلکہ اس کا ''پلے بوائے'' ہونا بھی کوئی راز نہیں ہوتا۔ یہ ہے مغربی تہذیب کی کلچرل اور کھیل پالیسی کی کامیابی۔

لڑکیوں کے اوپن کھیل

لڑکیوں کو اپنے ماحول میں، اپنے صنفی تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے، ہنسی مذاق، کھیل کود اور ورزش سے اسلام منع نہیں کرتا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ لڑکیاں بنیان اور نیکر پہن کر کھیلیں اور مرد تماشائی ہوں بلکہ مسلمان لڑکیوں کی ٹیمیں بیرون ملک بھی جائیں اور ساری دنیا ان کے میچ دیکھے ۔

اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش
مجبور ہیں، معذور ہیں، مردان خرد مند

کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ
آزادیٔ نسواں کہ زمرد کا گلوبند

میڈیا

آج میڈیا (ذرائع ابلاغ) بہت ترقی کر گیا ہے، اس کی بنیاد جدید سائنس و ٹیکنالوجی پر ہے۔ یہ تکنیکی وسائل اور آلات مغرب کی پیداوار اور اس کی اجارہ داری ہیں اور مسلمان محض ان کے درآمد کنندگان اور استعمال کرنے والے ہیں۔

- آج کے میڈیا کی دوسری بنیاد تنظیمی و مالی وسائل ہیں۔ مغرب کے پاس یہ وسائل بھی بکثرت موجود ہیں۔ مسلمانوں کے پاس یہ وسائل مقابلتاً کم بھی ہیں اور انہیں اس کے استعمال کا سلیقہ بھی نہیں۔
- اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مغرب میڈیا کی طاقت کے ذریعے اپنے سیاہ کو سفید بنا کر پیش کررہا ہے اور اس میں کامیاب ہے، اور ہم اپنے سفید کو سفید ثابت نہیں کر پارہے اور اس میں ناکام ہیں۔
- مغرب میڈیا کی طاقت کے ذریعے اپنی تہذیب، ثقافت، علوم، اقدار، مذہب سب کچھ زبردستی ہم پر کامیابی سے ٹھونستا چلا جارہا ہے۔
- اہل مغرب کی طرح ہندو بھی نہ صرف ہمارے وجود کا دشمن ہے بلکہ ہماری تہذیب اور علوم و اقدار کا بھی۔
- اور اس کی اپنی تہذیب و اقدار مغرب سے مماثل ہیں لہٰذا میڈیا کی طاقت سے ہمیں ہمارے اسلامی تشخص سے محروم کرنے کے لیے مغرب اور بھارت نے ہمارے خلاف گٹھ جوڑ کرلیا ہے۔
- مغرب کی حمایت سے بھارت کا تہذیبی و ثقافتی حملہ اتنا شدید، موثر اور کامیاب ہے کہ ہم اس کی مدافعت نہیں کرسکے، چنانچہ برسوں پہلے بھارتی قیادت نے ڈنکے کی چوٹ اعلان کیا کہ ہم نے پاکستان پر ثقافتی فتح حاصل کرلی ہے۔
لیکن ہم پاکستانی مسلمان اور خصوصاً ہماری قیادت اتنی بے حس، بے دین اور بے غیرت ہے کہ اسے اپنی ثقافتی شکست کا احساس ہی نہیں۔ جب احساس زیاں ہی نہیں تو زیاں کا مداوا کون کرے گا؟
- ہمارے دینی عناصر کا رویہ یہ ہے کہ یہ ہمارا فیلڈ ہی نہیں، یہ حکومت کا کام ہے۔ یاللعجب! میڈیا میں ہمارے علماء کرام کے پاس کیا ہے؟ چند محدود اشاعت کے ماہنامے اور ایک آدھ ناکام اخبار! نہ ریڈیو، نہ ٹی وی، نہ ISP، نہ فلم اور نہ متبادل دینی،

تعلیمی وتفریحی پروگرام اور نہ ان کاموں کے لیے درکار افراد کار۔ چلیے قصہ ختم ہوا۔

- کاش مسلمان اور پاکستانی جاگیں، اس وقت کرنے کا پہلا کام یہ ہے کہ مغرب اور بھارت کی میڈیا اور ثقافتی پالیسی کو علی الاعلان رد کر دیا جائے کہ یہ اسلام اور مسلمان دشمن ہے اور اپنی میڈیا پالیسی بنائی جائے جو ہمارے دین، ہماری اقدار، ہمارے علوم اور ہماری ثقافت کی علمبردار ہو۔ ہمیں میڈیا کے متعلق ٹیکنالوجی میں بھی خود کفالت حاصل کرنی چاہیے اور اس کے وسائل میں بھی۔
- ہماری حکومتیں اگر ہمارا ساتھ نہ دیں تو پرائیویٹ سیکٹر میں بھی بہت کچھ ہوسکتا ہے۔ ہم ہوش میں تو آئیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے اگر میڈیا میں سنجیدگی سے کام کرنا ہو تو مالی وسائل کی کمی بھی سد راہ نہیں بن سکتی۔ یہ قوم ابھی اتنی بھی بانجھ نہیں ہوئی بس ایسی مخلص قیادت کی کمی ہے جو اللہ کے سہارے، اللہ کے لیے کام کرنے کا جذبہ لے کر اٹھے اور حکمت سے کام کرے۔ کامیابی ان شاء اللہ اس کا مقدر ہوگی۔
- اس کے لیے افراد کار تیار کیے جائیں کہ اس کے لیے پیشہ ورانہ مہارت بھی درکار ہے۔
- ریڈیو، ٹی وی، فلم، انٹرنیٹ جیسے وسائل حاصل کیے جائیں۔
- ان کے لیے موزوں متبادل پروگرام تیار کیے جائیں
- یہ پروگرام پاکستانی مسلمانوں ہی کے لیے نہیں بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کے لیے ہونے چاہئیں اور انہیں عملاً ساری دنیا کے مسلمانوں تک پہنچنا چاہیے۔

جہاد

- جہاد دہشت گردی ہے۔
- جہاد تشدد اور عدم رواداری سکھاتا ہے۔
- جہاد انتہا پسندی کا مظہر ہے۔
- جہاد روس کے خلاف ہو تو جائز ہے، امریکہ اور برطانیہ کے خلاف ہو تو ناجائز ہے۔ اگر امریکہ اور اس کے اتحادی ہزاروں نہیں لاکھوں انسانوں کو افغانستان

اور عراق میں ذبح کر دیں، انہیں ایٹمی، ڈیزی کٹر، نیپام اور دوسرے زہریلے بموں سے اڑا دیں، ان کا تورا بورا بنا دیں تو یہ انصاف کی بالا دستی ہے اور اگر مسلمان درے کی بندوقوں سے اس کی مزاحمت کریں تو وہ تخریب کار اور دہشت گرد ہیں۔ اگر اسرائیل ان کے بیٹوں کو ذبح کر دے تو یہ عدل ہے اور وہ امریکہ اور یورپ کی ہر طرح کی سیاسی، مالی اور اسلحی مدد کا مستحق ہے لیکن اگر مسلمان ان پر غلیلیں بھی چلائیں تو وہ دہشت گرد ہیں اور قابل گردن زدنی ہیں۔

باطل کے فال وفر کی حفاظت کے واسطے
یورپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر

ہم پوچھتے ہیں شیخ کلیسا نواز سے
مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر

حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات
اسلام کا محاسبہ، یورپ سے درگزر

مغرب کے نقطۂ نظر سے جہاد واقعی برا ہے اور دہشت گردی ہے کیونکہ یہ مسلمانوں کو دبنا اور جھکنا نہیں سکھاتا۔ یہ باطل اور جارحیت کے خلاف ڈٹ جانے اور اس کا مقابلہ کرنے کا درس دیتا ہے۔ لہٰذا نصابی کتابوں سے جہاد سے متعلق آیات قابل اخراج ہیں۔ مدرسے بند ہونے چاہئیں یا ان میں سائنس اور ریاضی پڑھائی جانی چاہیے۔ جو مسلمان مغربی ظلم وستم کے خلاف زبان نہ کھولیں، اس کی بلا واسطہ یا بالواسطہ حمایت کریں وہ روشن خیال، معتدل اور ترقی پسند ہیں اور جو مغرب کی بالا دستی اور جارحیت قبول نہ کریں وہ دہشت گرد ہیں، جہادیے اور تخریب کار ہیں۔

دفاع

- امریکہ و یورپ کا اپنے مفاد میں مسلم ممالک سے دفاعی سمجھوتے کرنا اور پھر ان پر

عمل درآمد نہ کرنا، جیسے پاکستان کو سیٹو اور سینٹو میں شامل کیا گیا، روس کے خلاف افغان جنگ میں حلیف بنایا گیا لیکن جب کسی بحران میں مدد کا وقت آیا (جیسے مشرقی پاکستان میں) تو نہ کی گئی۔

- مسلمان ممالک کو ایٹمی صلاحیت نہ حاصل کرنے دینا

پاکستان اس وقت مسلم دنیا کی واحد ایٹمی قوت ہے اور اس کا جو حشر کیا گیا وہ کس کو بھولا ہے۔ اس جرم کی پاداش میں بھٹو کو پھانسی دی گئی،[1] ضیاء الحق کو زندہ جلا دیا گیا، نواز شریف کو اقتدار سے محروم کر کے جلاوطن کیا گیا، قدیر خان کو رسوا کیا گیا، مالی پابندیاں لگائی گئیں...... وغیرہ۔ صدام کو تہس نہس کر دیا گیا۔ لیبیا دباؤ برداشت نہ کر سکا اور سرنڈر کر گیا اور اب ایران دباؤ، تجارتی بائیکاٹ، بین الاقوامی پابندیوں اور جنگ کی دھمکیوں کی زد میں ہے۔

- مسلم ممالک کو دفاعی اسلحہ سازی میں خود کفیل نہ ہونے دینا۔
- مسلم ممالک میں اتحاد نہ ہونے دینا (OIC کو غیر موثر بنائے رکھنا) تاکہ وہ مل کر دفاعی کارخانے (اسلحہ ساز فیکٹریاں) اور تحقیقی ادارے (لیبارٹریاں) نہ بنالیں۔
- مسلمان ممالک کو ہمیشہ اپنا صارف بنا کر رکھنا تاکہ وہ مغربی اسلحہ خریدتے رہیں اور فاضل پرزوں اور مرمت کے لیے اس کے محتاج رہیں۔ پاکستان سے رقم کی وصولی کے باوجود ایف سولہ طیارے نہ دینا اس کی ایک مثال ہے۔
- مسلمان ممالک کو باہم لڑانا (جیسے کویت۔عراق اور ایران۔عراق جنگ) تاکہ مغرب کے اسلحے کے کارخانوں کو آرڈر ملتے رہیں۔
- مغربی ممالک خصوصاً امریکہ نے اب تک جتنا اسلحہ مسلم ممالک اور دیگر ترقی پذیر ممالک کو بیچا ہے، اس کے اعداد و شمار اور اس کے لیے جو طریقے اختیار کیے گئے ہیں ان کا مطالعہ ہوش ربا ہے لیکن اس کا توڑ تو تبھی ہو سکتا ہے جب مسلمان ہوش میں آئیں اور اس سب کچھ کا ادراک کریں۔

۱۔ اگرچہ بہت سے لوگوں کے نزدیک وہ بعض دوسرے اعمال کی وجہ سے بھی اس کا مستحق تھا۔

- امریکہ اور یورپ کا مسلم ممالک سے فوجی تربیت کے معاہدے کرنا۔ اس بہانے مسلمان ممالک کی فوج کے افسران کو مغربی ممالک میں بلا کر ان کی برین واشنگ کرنا، ان کو اپنی خفیہ ایجنسیوں کے جال میں جکڑنا اور ان سے تعلقات کار قائم کرنا تاکہ مستقبل میں کام آئیں۔
- مسلم ممالک کی فوج کو اندرون ملک سیاسی امور اور اقتدار کی جنگ میں الجھا دینا تاکہ اس کی پیشہ ورانہ صلاحیتیں کمزور ہو جائیں اور اسے عوام سے لڑانا تاکہ اس کی ساکھ ختم ہو جائے اور وہ کمزور ہو کر غیر موثر ہو جائے۔
- مسلمان ممالک کو ہمسایوں کے ساتھ لڑائیوں میں الجھا دینا تاکہ وہ بڑی فوج رکھنے اور اسلحہ خریدنے پر مجبور ہو جائیں۔ یوں ان کے بجٹ کا اکثر حصہ دفاع پر خرچ ہو جائے اور وہ مسلم عوام کی معاشی اور سماجی حالت نہ سدھار سکیں، جیسے پاکستان بھارت تنازعہ۔
- جھوٹ اور پروپیگنڈے کی مار دینا جیسے صدام کے خلاف تباہ کن ہتھیاروں کا جھوٹ بول بول کر پہلے اسے نہتا کیا گیا پھر اسی الزام میں اس پر حملہ کر کے عراق کی تکہ بوٹی کر دی گئی۔ اب پاکستان پر اسی قسم کا 'الزام' (؟) لگایا جا رہا ہے کہ اس کے ایٹمی ہتھیار انتہا پسندوں کے ہاتھ لگ جائیں گے۔
- مسلمان ممالک کو میدان جنگ بنانا اور وہاں اپنے نئے بنائے گئے ہتھیار ٹیسٹ کرنا جیسا کہ افغانستان اور عراق میں ہوا۔
- مسلمان اگر مغربی ممالک اور ان کے حمایتیوں کے مظالم کے خلاف ردعمل ظاہر کریں تو انہیں انتہا پسند اور دہشت گرد قرار دینا جیسے کہ فلسطین، کشمیر اور دوسری جگہوں پر ہو رہا ہے۔
- مسلم ممالک کے خلاف ایکشن لینے کے لیے نت نئے نظریات پیش کرنا جیسے انتہا پسندی کا نظریہ، تہذیبوں کی کشمکش کا نظریہ اور دہشت گردی کا نظریہ...... وغیرہ

- دہشت گردی کے فرضی الزام میں مسلمان ممالک پر سیاسی، معاشی اور ہر قسم کا دباؤ ڈالنا۔
- امیر مسلمان ممالک کے خلاف ایسا شکنجا کسنا کہ وہ معاشی وسائل سے محروم ہو جائیں مثلاً انہیں آپس کی لڑائیوں میں الجھانا، اس بہانے وہاں اپنی فوج اتارنا (جیسا کہ کویت، سعودی عرب اور عراق کے ساتھ ہوا) اور انہیں بھاری اور مہنگا اسلحہ بیچنا تاکہ وہ معاشی لحاظ سے دیوالیہ ہو جائیں اور اپنے عوام اور مسلمان امت کی بہتری کے لیے کچھ کر سکنے کے قابل نہ رہیں۔
- مسلم دشمن طاقتوں سے گٹھ جوڑ کرنا جیسے اسرائیل اور بھارت سے

صحت

- مغربی (ایلو پیتھک) طریق علاج کو سب سے بہتر سمجھنا۔
- ایلو پیتھک طریق علاج کی سرکاری سطح پر سرپرستی کرنا مثلاً اس کی تعلیم و تحقیق کا انتظام کرنا، فارغ ہونے والوں کو اچھی ملازمتیں مہیا کرنا، اس کے لیے ہسپتال قائم کرنا وغیرہ۔
- مقامی طریق علاج (جیسے دیسی طب (ہربل میڈیسن) اور دیگر عمدہ، سستے اور فطری طرق علاج (جیسے ہومیوپیتھی، نیچروپیتھی وغیرہ) کو حقیر سمجھنا، ان کی حوصلہ شکنی کرنا اور انہیں سرکاری سرپرستی سے محروم رکھنا مثلاً ان کی تدریس و تحقیق کا انتظام نہ کرنا، فارغ ہونے والوں کو سرکاری ملازمتیں نہ دینا یا چھوٹے گریڈ کی دینا، ان کے ہسپتال قائم نہ کرنا، پرائیویٹ سیکٹر میں اگر کوئی یہ سب کچھ کرنا چاہے تو اس کی راہ میں روڑے اٹکانا ...... وغیرہ۔

مندرجہ بالا امور ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہیں اور ان کا بنیادی سبب مغرب کی ذہنی غلامی ہے۔ اور اب تو یہ سب کچھ اس طرح روٹین کا حصہ بن گیا ہے کہ کسی کو غیریت بھی محسوس نہیں ہوتی۔ حالانکہ مقامی طریق علاج ہمارے مزاج اور ماحول سے زیادہ

مطابقت رکھتا ہے اور بعض دوسرے مغربی طرق علاج جیسے ہومیو پیتھی اور نیچرو پیتھی وغیرہ ایلو پیتھک کے مقابلے میں کہیں سستے، موثر اور فطری ہیں لیکن چونکہ انگریز حکومت ایلو پیتھک طریق علاج کو سرکاری سطح پر مروج کر گئی تھی، اس لیے ہمارے سیاسی و انتظامی بزرجمہر اب اس سے ہٹ کر سوچ ہی نہیں سکتے۔ اور اب تو ایلو پیتھک کے پیچھے جو یہودی ملٹی نیشنل دوا ساز کمپنیاں ہیں وہ اتنی مالدار اور طاقتور ہیں کہ وہ ہماری حکومتوں کی صحت کے بارے میں پالیسیوں پر باقاعدہ اثر انداز ہوتی ہیں اور انہیں اپنے سحر میں جکڑ کر رکھتی ہیں اور مغربی حکومتیں ان کی پشت پناہی کرتی ہیں۔

صنعت

۱۔ مغرب کی پالیسی یہ رہی ہے کہ مسلمان ممالک میں بنیادی اور اہم صنعتیں مثلاً بھاری مشینری اور سٹیل کے کارخانے، الیکٹرونکس اور کمپیوٹر وغیرہ کی صنعتیں پروان نہ چڑھنے دی جائیں۔

۲۔ مسلم ممالک کو صنعتوں کا بنیادی ڈھانچہ (انفراسٹرکچر) اور بنیادی مہارتیں نہ مہیا ہونے دی جائیں۔

تاکہ مسلم ممالک صنعتی ترقی میں خود کفیل نہ ہو جائیں۔ بلکہ ان سے خام مال خریدلیا جائے اور انہیں تیار شدہ چیزیں بیچی جائیں تاکہ مغربی پروڈکٹس کو مارکیٹیں ملتی رہیں اور ان کی اشیاء مہنگے داموں بکتی رہیں، ان کے کارخانے چلتے رہیں، ان کے مزدور روزگار پر لگے رہیں اور مسلم ممالک محض صارف (Consumers) کا کردار ادا کرتے رہیں۔

ان مقاصد کے حصول کے لیے مغرب (اور یہود) کی دوررس پالیسی یہ رہی ہے کہ مسلم ممالک کو آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک کے ذریعے قرضوں کے جال میں جکڑ دیا جائے، ان کی معیشت کو برباد کر دیا جائے، سیاسی عدم استحکام کے ذریعے حکمرانوں کو اپنے ماتحت رکھا جائے اور مسلم ممالک میں ایسے لوگ برسر اقتدار لائے جائیں، جو

اقتدار میں رہنے کے لیے مغربی اشیرباد اور حمایت کے محتاج ہوں، جو مغرب کے پڑھے ہوئے اور تربیت یافتہ ہوں، اس کی تہذیب کے رسیا ہوں، اس کی ترقی سے مرعوب ہوں، ان کے ''ماہرانہ مشوروں'' کو اہمیت دیں اور ان کی ''ترقیاتی حکمت عملی'' کو سینے سے لگائیں۔

مغرب کی یہ پالیسی کامیاب رہی ہے اور آج کوئی مسلم ملک بھی کامیاب صنعتی ملک نہیں ہے، کوئی مسلمان ملک بھی بنیادی صنعتوں میں خودکفیل نہیں ہے بلکہ ہر مسلم ملک اپنا قیمتی زرمبادلہ مغرب سے چھوٹی چھوٹی اشیاء درآمد کرنے میں لگا دیتا ہے۔

اس کی دیگر وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مسلم ممالک میں ایسے آزاد علمی و تحقیقی ادارے (تھنک ٹینک) نہیں ہیں جہاں ایسے آزاد ذہن ہوں جو مغربی پالیسیوں کا تنقیدی اور تحلیلی مطالعہ کر سکیں اور مسلم عوام اور حکمرانوں کو صحیح صورتحال سے آگاہ کر سکیں اور بالفرض کوئی اکا دکا دانش ور، محقق یا سیاستدان اس طرح کی باتیں کرے بھی تو وہ ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہیں، ان کو بے وزن، بے تکا، بے وقت کی راگنی ...... وغیرہ قرار دے دیا جاتا ہے، اور اس کی آواز خاموش کرا دی جاتی ہے۔

تجارت

مغرب کی پالیسی یہ رہی ہے کہ:

مسلم ممالک آپس میں تجارت نہ کریں۔

جہاں وہ زمینی طور پر ایک دوسرے کے قریب ہیں، آپس میں ملے ہوئے ہیں وہاں وہ مشترکہ مارکیٹیں تشکیل نہ دے سکیں مثلاً افریقہ میں، مشرق وسطیٰ میں اور جنوب مشرقی ایشیا میں۔

اس غرض سے ان کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کی جاتی ہیں، انہیں ایک دوسرے

کے خلاف ورغلایا، بھڑکایا اور باہم لڑایا جاتا ہے، ان کے ہاں مالی اور سیاسی عدم استحکام پیدا کیا جاتا ہے۔

- آج کل ایسے ریجنل گروپ اور مارکیٹیں تشکیل دی جارہی ہیں جہاں قیادت غیر مسلم ممالک کو حاصل ہو اور مسلمان ممالک محض طفیلی بن کر رہ جائیں مثلاً ہمارے ہاں 'سارک' بنی جس میں بھارت سب سے بڑا ملک ہے اور اسے بڑی حد تک کنٹرول کرتا ہے۔ یہی حال آسیان اور دوسری تنظیموں کا ہے۔

- جیسا کہ ابھی گزر چکا ہے کہ مغرب نے عمداً اور شعوری طور پر اپنی حکمت عملی، جدوجہد اور سازشوں سے یہ کامیاب پالیسی بنائی اور چلائی ہے کہ تجارت میں مغرب کا پلہ بھاری رہے، مسلم ممالک محض درآمد کنندگان اور صارف رہیں اور اپنا قیمتی (hard earned) زرمبادلہ مغرب سے معمولی اور غیر ضروری اشیاء درآمد کرنے میں خرچ کرتے رہیں۔ اور مسلمان ممالک اور ان کے پالیسی ساز اور حکمران بدھوؤں کی طرح اس پالیسی کو من وعن قبول کرتے رہے ہیں اور آج بھی کر رہے ہیں۔

- اور اب گلوبلائزیشن کا چکر چلایا جارہا ہے جس میں تجارت کو 'اوپن' کیا جارہا ہے۔ اور چونکہ 'تجارتی توازن' پہلے سے مغرب کے امیر ممالک کے حق میں ہے اس لیے اس گلوبلائزیشن کا فائدہ بھی مغرب کو ہوگا بلکہ اب اس کو کھلی اور قانونی چھوٹ مل جائے گی اور غریب مسلم ممالک کا ہر قسم کا استحصال جائز اور قانونی شکل اختیار کرلے گا اور مسلم ممالک کی تجارت اور معیشت ان کے قبضے میں چلی جائے گی۔ اور لطف یہ ہے کہ مسلم ممالک اب بھی خواب خرگوش میں محو ہیں اور ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کے سارے معاہدوں پر آنکھیں بند کر کے دستخط کیے چلے جارہے ہیں۔ اسلامی کانفرنس تنظیم نہ ہونے کے برابر ہے اور

اسے افیون کھلا کر سلا دیا گیا ہے۔ کوئی نہیں ہے جو مسلم امہ اور مسلمانوں کے مفادات کا سوچے، اس گلوبلائزیشن کی مزاحمت کرے اور مسلم امہ کے مفادات کے لیے متبادل تجارتی اور مالی پالیسیاں وضع کرے اور متبادل ادارے کھڑے کرنے کی پلاننگ کرے۔

زراعت

- مسلم ممالک میں پانی کی کمی نہیں ہے۔ ان کے پاس زراعت کے لیے وسیع میدان موجود ہیں۔ بہت سی معدنیات میں انہیں اجارہ داری حاصل ہے، جیسے تیل اور پٹ سن وغیرہ۔ امیر مسلم ممالک کے پاس مالیات کی بھی کمی نہیں ہے لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کی خود فراموشی، بے حسی اور ناقص حکمت عملی کی انتہا یہ ہے کہ مسلمان عوام بھوک سے مر رہے ہیں اور قابل شرم بات یہ کہ پھر عالمی سطح پر ان کی امداد کے نام سے ان کو ذلیل و رسوا کیا جاتا ہے۔ افریقہ میں قحط کے مارے سوکھے سڑے مسلمان بچوں کی دردناک تصویریں مغربی میڈیا کے ذریعے ساری دنیا میں گھر گھر دکھائی جاتی ہیں اور یوں ان کی غربت، بے بسی، نالائقی اور قابل رحم ہونے کا مذاق اڑایا جاتا ہے اور ہماری ڈھٹائی کا عالم یہ ہے کہ اس سب کے باوجود ہمارے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔

- بنیادی طور پر اس صورت حال کے ذمہ دار ہم خود ہی ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس پردہ زنگاری کے پیچھے بھی مغربی معشوق ہی ہے۔ دور کیوں جائیے! پاکستان کی حالت دیکھ لیجیے۔ پانچ دریاؤں کی یہ سرزمین سونا اُگلتی تھی اور اناج یہاں سے برآمد کیا جاتا تھا۔ آج یہ حالت ہے کہ پاکستان قیمتی زرمبادلہ دے کر گندم خریدتا ہے بلکہ قرض لیتا ہے۔ اور آج (اگست ۲۰۰۵ء میں) یہ حالت ہے کہ سبزیاں، پیاز اور آلو بھی بھارت سے درآمد کیے جا رہے ہیں۔ تفو بر تو اے چرخ گردوں تفو۔ اور کوئی نہیں ہے جو یہ سوچے کہ ایسا کیوں کر ہوا؟

پہلے مغرب نے سازش سے کشمیر بھارت کو دلوایا کہ پاکستان میں بہنے والے دریاؤں کے منابع اس کی جان کے دشمن کے پاس رہیں۔ پھر اس کشیدگی کو دور کرنے کے لیے ورلڈ بنک کی بلی حرکت میں آئی اور سندھ طاس معاہدے کے ذریعے پاکستان کے کئی دریا بھارت کو دے دیئے گئے۔ پھر بھارت نے باقی ماندہ دریاؤں پر ڈیم بنا لیے اور اب ہمارے دریا خشک پڑے ہیں اور ہم شکایت لے کر کہاں جاتے ہیں اسی ورلڈ بنک کے پاس۔ گویا اسی عطار سے دوا لیتے ہیں جو مرض کا سبب ہے۔ ہم بھی کیا سادہ لوح لوگ ہیں؟

پھر ہمارے ہاں کہیں سے 'امریکی سنڈیاں' آ جاتی ہیں جو ہماری قیمتی فصلوں کو چٹ کر جاتی ہیں۔ ان سنڈیوں کو مارنے کے لیے امریکہ اور یورپ سے کیڑے مار ادویات قیمتی زرمبادلہ سے خرید کر درآمد کی جاتی ہیں لیکن یہ سنڈیاں کبھی نہیں مرتیں۔ غالباً ہم اس سے پہلے یہ ذکر کر چکے ہیں کہ لاہور کے ایک ہومیو پیتھ ڈاکٹر نے مقامی طور پر تیار کردہ ادویات سے کیڑے مار مرکبات تیار کر کے اور اس کے عمدہ نتائج عملاً دکھا کر حکومت سے کہا کہ کیڑے مار ادویات (زہر) درآمد کرنے بند کیے جائیں لیکن مغرب کی ملٹی نیشنلز کا مقابلہ کرنا کیا آسان ہے؟ اور جن غدار مسلمان پاکستانیوں کو کمشن کھانے اور ناجائز مراعات کے حصول کا ناقابل علاج مرض لگ چکا ہے، ان کا علاج کہیں ہو سکتا ہے؟

اتحادِ امت

- ہمارا دین اور نظریۂ حیات ہمیں ایک ہونے کا درس دیتا تھا، ہم نے یہ درس بھلا دیا۔ مغرب نے پہلے دن سے ہمیں کمزور کرنے کے لیے ہمارے اندر انتشار اور افتراق کے بیج بوئے۔ پہلی جنگ عظیم سے بھی پہلے اس نے کامیابی سے عربوں کو ترکوں کے خلاف لا کھڑا کیا۔
- اس نے اگلا کامیاب وار یہ کیا کہ مسلمانوں کا مرکزی نظام جو سبب اتحاد تھا (یعنی

خلافت) اسے ختم کر دیا بلکہ نام نہاد مسلمانوں ہی کے ذریعے اسے ختم کروایا۔

- پھر جب دو عظیم جنگوں کی شکست و ریخت اور مسلم ممالک میں آزادی کی تحریکوں کے دباؤ کی وجہ سے اسے مسلم ممالک سے نکلنے پر مجبور ہونا پڑا تو اس نے یہ حکمت عملی اختیار کی کہ مسلم علاقوں کو چھوٹی چھوٹی خودمختار ریاستوں میں بانٹ دیا تاکہ وہ کمزور رہیں، باہم دست وگریباں رہیں، متحد نہ ہوسکیں اور طاقت ور نہ ہوسکیں۔صرف ایک مثال: ماضی میں جو علاقہ شام یا فلسطین کہلاتا تھا اور زمینی، جغرافیائی، نسلی، لسانی ہر لحاظ سے ایک وحدت تھا اور خود مغرب کے نیشنلزم کے نظریے کے مطابق علاقے، نسل، رنگ اور زبان کے اشتراک کی بنیاد پر اسے ایک ریاست ہونا چاہیے تھا، اسے چھ ریاستوں میں تقسیم کیا گیا یعنی لبنان، شام، اردن، اسرائیل، فلسطین اور مصر۔یہی حال باقی عالم اسلام کا ہے کہ اس وقت اس میں چھوٹے چھوٹے ستاون ممالک موجود ہیں۔
- امہ کے اتحاد کے مخلص داعیوں کو قتل کرا دیا جیسے شاہ فیصل شہید کو
- امت کے اتحاد کے جتنے بھی پلیٹ فارم بنے، ان میں نفوذ کر کے انہیں عضو معطل بنا دیا اور وہ محض برائے نام موجود ہیں عملاً متحرک نہیں جیسے او آئی سی۔موتمر عالم اسلامی، رابطہ عالم اسلامی وغیرہ۔
- ایسے لوگوں کو حکمران بنایا اور انہیں مستحکم کیا جو اپنے ذاتی اور درحقیقت مغربی مفاد کے لیے اتحاد امت کے خلاف تھے، چنانچہ عالم اسلام کے دوسرے سب سے بڑے اور پہلی ایٹمی طاقت پاکستان کے فوجی صدر (جنرل پرویز مشرف) نے ''سب سے پہلے پاکستان'' کا نعرہ لگایا اور جب بھارت اور جاپان وغیرہ سلامتی کونسل کی نشستوں کے لیے کوشاں تھے تو پاکستانی وزیر خارجہ نے ان کی مخالفت کے ساتھ اس امر کی بھی مخالفت کی کہ سلامتی کونسل میں عالم اسلام کی بھی ایک نشست ہونی چاہیے، اور اس کے لیے دلیل یہ دی کہ وہاں نمائندگی مذہب کی بنیاد پر نہیں ہوتی۔حالانکہ جاپان کی آبادی پاکستان سے آدھی ہے جبکہ دنیا میں

مسلمانوں کی تعداد پونے دو ارب کے قریب ہے یعنی پوری دنیا کی تقریباً ایک چوتھائی۔ لیکن ان کو کون سمجھا سکتا ہے جو عقل کے اندھے ہوں اور دنیا کے ہر معاملے کو مغرب کی عینک سے دیکھتے ہوں؟

ضرورت اس امر کی ہے کہ وہ افراد اور ممالک جو اخلاص کے ساتھ مسلم امہ کے اتحاد کے داعی ہیں، وہ متحد ہو جائیں اور اس کے لیے عملی اقدامات کا آغاز کریں اور مسلم اتحاد کے خلاف مغرب کی سازشوں کو ناکام بنائیں۔ [1]

ا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ہماری کتاب ''مسلم نشاۃ ثانیہ۔اساس اور لائحہ عمل'' کتاب سرائے، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور

مبحث سوم

کچھ علاج اس کا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں

اگر چہ اس تحریر کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ مغربی تہذیب کے ان غیر اسلامی اوضاع ومظاہر اور رسوم ورواج کی نشان دہی کردی جائے جو بتدریج مسلم معاشرے میں در آئے ہیں اور مسلمانوں کی نئی نسل ان سے اس طرح مانوس ہوگئی ہے کہ انہیں احساس بھی نہیں ہوتا کہ یہ افکار واعمال مغرب سے درآمد شدہ ہیں۔ لیکن مناسب محسوس ہوتا ہے کہ اس بحث کے آخر میں ان کی توجہ اس طرف بھی مبذول کروادی جائے کہ یہ افکار واعمال غیر اسلامی ہیں اور ہمارے دینی وملی جسم وروح اور مقاصد سے مغایرت رکھتے ہیں لہٰذا ان کا رد اور قلع قمع ضروری ہے۔ ان کی حیثیت ہمارے جسد ملت میں نا مطلوب اجنبی مواد (foreign matter) کی سی ہے جس نے جسم کے فطری نظام صحت کو بگاڑ دیا ہو اور اسے طرح طرح کے امراض میں مبتلا کر دیا ہو۔ لہٰذا ہم اگر صحت کے متمنی ہیں تو ضروری ہے کہ اس نا مطلوب اجنبی مواد سے نجات پائی جائے اور جسد ملت کو اس کی آلودگی سے پاک کیا جائے اور جسم کو ایسی خوراک مہیا کی جائے جو اس کی فطرت کے مطابق اور اس کے مزاج کے موافق ہو تا کہ معدہ اور جگر وغیرہ اسے قبول کریں، وہ جزو بدن بنے اور توانائی پیدا کرے تا کہ جسم مضبوط اور صحت مند ہو جائے اور حالت مرض ختم ہو جائے۔

یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ جب کوئی کمزور اور سیریس مریض ڈاکٹر یا حکیم کے پاس پہنچتا ہے تو وہ ڈاکٹر سب سے پہلے یہ جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ اسے کیا بیماری لاحق ہے اور اس کا سبب کیا ہے؟ اس کے لیے وہ خود بھی تفتیش کرتا ہے، مریض کا ٹمپریچر نوٹ کرتا ہے، بلڈ پریشر دیکھتا ہے، نبض چیک کرتا ہے زبان کا رنگ دیکھتا ہے...... وغیرہ اور ضرورت محسوس کرے تو مریض کو لیبارٹری بھیجتا ہے اور اس کے مختلف ٹیسٹ کرواتا ہے تا کہ اس کے مرض کی صحیح صحیح نشان دہی ہو جائے۔ اس طرح جب مرض کی تشخیص ہو جائے اور اس کے سبب کا پتہ چل جائے تو پھر وہ اس کا علاج کرتا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ

کو منظور ہو تو مریض کو شفا ہو جاتی ہے۔

امت مسلمہ کو بھی اس وقت ضعف وادبار کا مرض لاحق ہے لہٰذا اس کی تشخیص ضروری ہے کہ اس مرض کا سبب کیا ہے؟ اور جب مرض کا سبب معلوم ہو جائے تو پھر علاج ضروری ہے، مناسب پرہیز اور دوا ضروری ہے تاکہ مریض کو صحت حاصل ہو جائے۔ ہمارے نزدیک مسلم معاشرے کو دو بنیادی اور بڑے مرض لاحق ہیں۔ اس کا پہلا اور بنیادی مرض یہ ہے کہ وہ دین سے دور ہو گیا ہے۔ مسلمان بالعموم دینی تعلیمات پر عمل نہیں کرتے اور دینی تقاضوں پر پورا نہیں اترتے۔ یہ ایک فطری اور معروضی منہج ہے کہ کوئی معاشرہ جب اس نظریۂ حیات پر پوری شدت اور لگن سے عمل کرے جس پر وہ یقین رکھتا ہے تو اس کے اندر وہ خوبیاں ابھر آتی ہیں جو دنیا میں اسباب مہیا کرنے کے لیے ضروری ہیں لہٰذا وہ ترقی اور عروج سے ہمکنار رہتا ہے، جیسا کہ ابتدائی صدیوں میں مسلمان ہوئے۔ اور جب بھی کوئی معاشرہ اپنے اس نظریۂ حیات پر عمل چھوڑ دیتا ہے جس پر وہ ایمان لانے کا دعویٰ کرتا ہے اور منافقت کا رویہ اپناتا ہے تو اس کے اندر وہ خوبیاں باقی نہیں رہتیں جو اسباب دنیا مہیا کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ نتیجتاً وہ کمزور اور ضعیف ہو جاتا ہے اور دوسری طاقتور قوموں کے لیے آسان شکار بن جاتا ہے۔ چونکہ اِس وقت مسلمانوں نے اپنے نظریۂ حیات (دین اسلام) کے مطابق عمل کرنا ترک دیا ہے، اس لیے وہ ضعف و اضمحلال میں مبتلا ہیں اور طاقتور دشمن قوموں کے لیے تر نوالہ بنے ہوئے ہیں۔

مسلمان معاشرے کا دوسرا بڑا مرض یہ ہے کہ اس نے، خصوصاً اس کے مقتدر طبقات نے، اپنے نظریۂ حیات اور اس پر مبنی تہذیب و تمدن کو چھوڑ کر ایک ایسی تہذیب کی پیروی شروع کر دی ہے جس کی فکر اور اقدار مسلمانوں کی فکر اور اقدار کے بالکل الٹ ہیں۔ ان کا یہ رویہ اس غلط فہمی پر مبنی ہے کہ چونکہ یہ تہذیب اس وقت دنیا میں غالب اور مقتدر ہے اور جو قومیں اس تہذیب کی حامل ہیں وہ ترقی یافتہ، مضبوط اور طاقتور ہیں لہٰذا اگر مسلمان اس تہذیب کی پیروی کریں گے تو وہ بھی ترقی کر سکیں گے اور عروج حاصل کر سکیں گے۔ لیکن اس تہذیب کی پیروی کا نتیجہ عملاً یہ نکلا ہے کہ ان کے

مرض ضعف میں کمی آنے کی بجائے اس میں مزید اضافہ ہوگیا ہے اور ہماری رائے میں یہ بالکل صحیح اور منطقی ہے اور ایسا ہی ہونا چاہیے تھا کیونکہ اس (مغربی) تہذیب کے اصول (سیکولرزم، ہیومنزم، لبرلزم ...... وغیرہ) اور اقدار (دنیا پرستی، مادہ پرستی، وحی کا انکار، فحاشی اور بے حیائی ...... وغیرہ) مسلم فکر اور اقدار کے بالکل الٹ ہیں اور اس اجتماع ضدین کا نتیجہ لامحالہ یہی نکلے گا کہ ایک یکسو، متحد اور مستحکم مسلم شخصیت وجود میں نہ آسکے گی اور مسلمان معاشرہ فکری انتشار کی وجہ سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے گا اور ضعف اور ادبار اس کا مقدر بن جائے گا۔

مغربی تہذیب کی وجہ سے مسلمانوں کے ضعف کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ مغربی تہذیب کے حامل ممالک اسلام اور ملک دشمن ہیں (گو وہ اپنے مفاد کے لیے اسے ڈپلومیسی اور منافقت کے لبادے میں چھپاتے ہیں) اور وہ انہیں کمزور اور زیر دست رکھنے کے لیے ہر حربہ اختیار کرتے ہیں (مثلاً ان کا سیاسی اور معاشی استحصال، انہیں متحد نہ ہونے دینا، آپس میں لڑانا، انہیں قرضوں میں جکڑنا، جو سر اٹھائے اسے کچل دینا، اپنی تعلیم اور ثقافت ان پر مسلط رکھنا ...... وغیرہ)۔ اس دوسرے مرض کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مسلمانوں کو واضح طور پر یہ بتا دیا ہے کہ یہود و نصاریٰ تمہارے اور تمہارے دین کے دشمن ہیں ان سے کسی خیر کی توقع نہ کرو، لہٰذا مسلمان اگر اس کے باوجود یہود و نصاریٰ (اہل مغرب) کی پیروی کرتے ہیں اور ان کی بالادستی قبول کر کے ان کے ساتھ دوستی رکھتے ہیں تو ظاہر ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صریح مخالفت کرتے ہیں اور اپنے نظریہ حیات کا مذاق اڑاتے ہیں۔

ان اسباب کی بنا پر مغربی تہذیب کی پیروی دوسرا بڑا اور بنیادی مرض ہے جس میں مسلمان معاشرے مبتلا ہیں اور مذکورہ بالا دونوں امراض ایسے ہیں جنہوں نے مسلم معاشرے کی صحت کو برباد کیا ہوا ہے، اس کے اعضائے رئیسہ کی کارکردگی کو بگاڑ دیا ہے

اور اس کی صحت قطعاً ممکن نہیں جب تک ان دو بیماریوں پر قابو نہ پایا جائے۔

سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کی ان دو بنیادی (اور دیگر بہت سی ضمنی) بیماریوں پر کیسے قابو پایا جائے؟ اس کا واضح جواب ایک ہی ہے جو قرآن وسنت کے مطالعے اور مسلم امہ کے اپنے تجربے سے ہمارے سامنے آتا ہے اور وہ ہے ''اپنے نظریۂ حیات سے محکم وابستگی اور اس کے تقاضوں پر عمل''۔ اس علاج کو معمولی اور سادہ نہ سمجھیے، اس کے اندر ایک جہانِ معنیٰ آباد ہے بشرطیکہ آپ اس کی نوعیت، کنہ اور اس کے طریق کار کو اچھی طرح اور ٹھیک ٹھیک سمجھ جائیں۔

دیکھیے! آپ کسی نظریے سے اس وقت تک محکم طور پر وابستہ نہیں ہو سکتے جب تک اس پر آپ کا پختہ ایمان اور یقین نہ ہو اور یہ ایمان اور یقین اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتا جب تک آپ کو اس کا 'علم' نہ ہو اور جب تک آپ اس علم کے مطابق عمل نہ کریں اور اپنے آپ کو اس کے تقاضوں کے مطابق ڈھال نہ لیں۔ اور علم حاصل ہوتا ہے تعلیم سے یعنی سیکھنے کے عمل سے اور عمل پیدا ہوتا ہے ممارست اور تربیت سے اور یہ بھی ضروری ہے کہ یہ علم وعمل مبنی ہوں کسی مستند اور محکم اساس پر، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں اس منہج کا ذکر کرتے ہوئے ''تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیہ'' کا فارمولا بیان فرمایا[1] یعنی یہ علم مبنی ہونا چاہیے وحی کی محکم اساس پر۔ اور اسی اساس کے مطابق اسے عمل میں ڈھلنا چاہیے۔ قرآن حکیم ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سارے انبیاء کو معاشرے میں تبدیلی کا یہی طریقہ بتایا تھا[2] اور اپنے آخری رسول حضرت محمد ﷺ کو بھی اسی طریقے کی تلقین کی تھی[3] چنانچہ آپؐ نے اس منہج پر عمل کرتے ہوئے صحابہ

۱۔ الجمعہ۶۲:۲

۲۔ الاعلیٰ ۸۷:۱۴۔۱۷

۳۔ البقرۃ:۲:۱۵۱

کرام کی تربیت فرمائی اور اپنی امت کو بھی حکم دیا کہ اسی پر عمل کرتے رہنا[۱]
مسلمانوں نے 'تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیہ' جسے آج کل کی اصطلاح میں ''تعلیم وتربیت'' کہا جا سکتا ہے (مسلم روایت میں اسے دعوت واصلاح، امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور تبلیغ وغیرہ بھی کہا جاتا رہا ہے) کے فارمولے پر عمل کیا اور دنیا پر غالب آ گئے۔ لیکن یہ ذہن میں رہے کہ محض تعلیم وتربیت نہیں بلکہ صرف وہ تعلیم وتربیت جو قرآن حکیم کی محکم اساس پر مبنی اور اس کے مطابق ہو اور علم سے مراد محض دینی علم نہیں بلکہ ہر وہ علم ہے جس کی مسلم معاشرے کو ضرورت ہو۔

تو حاصل یہ کہ قرآن وسنت کی رہنمائی یہ ہے کہ آج مسلمان اگر اپنی بیماریوں سے نجات چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ وہ قرآن حکیم کے آب حیات کی طرف رجوع کریں کیونکہ وہ ہمارے خالق ومالک کی طرف سے بھیجا ہی اس لیے گیا ہے کہ وہ ہماری بیماریوں کا علاج کرے[۲] اور زندگی گزارنے کے سیدھے اور سچے راستے کی طرف ہماری رہنمائی کرے[۳] لہٰذا مسلمان اگر قعر ذلت سے باہر آنا چاہتے ہیں، اپنی بیماریوں پر قابو پانا چاہتے ہیں، اپنے ضعف کو قوت سے بدلنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے قرآنی نسخہ یہ ہے کہ وہ اپنے تعلیم وتربیت کے نظام کو قرآن وسنت کے مطابق بدل دیں۔
ممکن ہے آپ سوچیں کہ اس سے کیا ہوگا؟ اس سے اتنی بڑی تبدیلی کیسے آئے گی؟ جناب! بات یہ ہے کہ انسانی معاشرے میں ہر قسم کی تبدیلی وترقی کا منبع انسان ہوتا ہے۔ آپ انسان کو بدل دیں تو سب کچھ بدل جائے گا (اس کے لیے آج کل Human Development کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے)۔ تو آج مسلمان معاشرے کی بنیادی ضرورت 'انسان سازی' اور 'مسلمان سازی' ہے۔ یہ کام جب کچھ

۱۔ البقرہ۲:۱۴۳، آل عمران۳:۱۰۴

۲۔ یونس۱۰:۵۷

۳۔ الاسراء۱۷:۹

حد تک بھی ہو گیا تو باقی سارے کام یہ 'انسان' اور 'مسلمان' خود کرلیں گے۔ ہمارے معاشرے میں آج بہت کچھ ہو رہا ہے، نہیں ہو رہا تو قرآن وسنت کے مطابق یہ 'انسان سازی' اور 'مسلمان سازی' کا کام نہیں ہو رہا۔ لہٰذا اسی کے کرنے کی ضرورت ہے۔

بعض لوگ سوچتے ہیں کہ یہ حکومتوں کے کرنے کا کام ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ حکومتوں کے کرنے کا کام ہے اور آج ہر مسلمان حکمران کی یہ بنیادی ذمہ داری ہے کہ وہ یہ کام کرے لیکن اگر حکمران یہ کام نہ کریں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ امت کے دوسرے طبقے علماء، صوفیاء، دانش ور، صحافی، ادیب اور سیاستدان وغیرہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں کہ یہ تو حکمرانوں کے کرنے کا کام ہے، ہمارا نہیں۔ بلکہ انہیں یہ کام کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، اس کے لیے منصوبہ بندی کرنی چاہیے، اس کے لیے وسائل اکٹھے کرنے چاہئیں اور اس کے لیے سارے پر امن ذرائع استعمال کرنے چاہئیں اور یہ کام جتنا زیادہ ہو سکے، جہاں ہو سکے، جب ہو سکے، کرتے رہنا چاہیے۔

اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ ہم دوسرے دینی اور تعمیری کاموں کی نفی کر رہے ہیں کہ اور کوئی دینی کام نہیں کرنا چاہیے یا ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ہرگز نہیں! سارے دینی کام کرنے کے ہیں اور وہ کرنے چاہئیں اور وہ اہم بھی ہیں۔ ہم جو بات کہہ رہے ہیں وہ یہ ہے کہ قرآن حکیم کی رو سے بنیادی سٹریٹجی، اصل الاصول اور کرنے کا بنیادی اور صحیح کام "تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیہ" کا ہے۔ آپ جب تعلیم وتزکیے سے افراد کی تعمیر سیرت وکردار کے ذریعے 'صحیح انسان' اور 'صحیح مسلمان' پیدا کرنے شروع کر دیں گے تو وہ ہر قسم کے دینی تقاضوں پر عمل کریں گے اور زندگی کے ہر شعبے میں کام کریں گے۔

بعض لوگ صحیح اسلامی نظام تعلیم وتربیت پر ہمارے اصرار کی اہمیت کو نہیں سمجھتے اور کہتے ہیں کہ ہمیں تو ترقی کے لیے سائنس وٹیکنالوجی کی ضرورت ہے اور آپ کہتے ہیں کہ قرآن وحدیث پڑھو اور نمازیں پڑھو۔ یہ کام تو ہم پہلے بھی کر رہے ہیں اور اس کے باوجود دنیا میں ذلیل وخوار ہو رہے ہیں؟ بات یہ ہے کہ ہمیں سائنس وٹیکنالوجی کی اہمیت سے انکار نہیں اور نہ ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ سائنس وٹیکنالوجی میں مہارت حاصل نہ کرو،

اس میں پیش رفت نہ کرو۔ لیکن یہ حضرات اس پر غور نہیں کرتے کہ سائنس وٹیکنالوجی میں پیش رفت کیسے ہوسکتی ہے؟ ایک اچھی سائنسی لیبارٹری کے لیے کروڑوں ڈالر درکار ہوتے ہیں؟ یہ کہاں سے آئیں گے؟ گویا آپ کو سائنس وٹیکنالوجی میں پیش رفت کے لیے معاشی استحکام چاہیے۔ معاشی استحکام کیسے پیدا ہوسکتا ہے؟ اس کے لیے بنیادی ضرورت معاشرتی ہم آہنگی اور سیاسی استحکام کی ہے؟ اور معاشرتی ہم آہنگی اور سیاسی استحکام کے لیے ضروری ہے کہ افراد معاشرہ میں فکری ہم آہنگی ہو، اتحاد ہو، وہ قانون کی پابندی کریں، اپنی قیادت کی اطاعت کریں، محنت کریں اور اجتماعی مفاد کے لیے ذاتی مفادات کی قربانی دیں۔ اور یہ ساری خوبیاں افراد میں اسی وقت پیدا ہوتی ہیں جب ان کا کوئی نظریۂ حیات ہو، ان کا کوئی نصب العین ہو اور وہ اس نظریے اور نصب العین سے شدید محبت رکھتے ہوں، اس پر پختہ یقین رکھتے ہوں اور یہ نظریہ اور نصب العین جس عمل کا تقاضا کرے، وہ دلی خوشی اور رغبت سے وہ عمل کرتے ہوں۔ گویا بات پھر وہیں آ گئی کہ ترقی وعروج کے لیے بنیادی ضرورت اس امر کی ہے کہ افراد معاشرہ کا ایک نظریۂ حیات اور نصب العین ہونا چاہیے جس سے وہ محکم طور پر وابستہ ہوں۔ یہی اور فقط یہی چیز ان کے اندر وہ خوبیاں ابھار سکتی ہے جو دنیا میں اسباب کی فراہمی کے لیے ضروری ہیں بلکہ اس دنیا میں فراہمیٔ اسباب کے لیے جو منافست اور مسابقت جاری ہے، اس میں انہیں برتر حیثیت دلا سکتی ہے اور انہیں ترقی وعروج کی طرف لے جا سکتی ہے۔ مسلمانوں کا تجربہ یہ ہے کہ اسی چیز نے چودہ صدیاں پیشتر ان کے عروج کی بنیادیں رکھی تھیں۔

مسلمانوں کی قوت وعظمت کی بنیادیں نبی کریم ﷺ نے اور آپؐ کے تیار کردہ افراد ابوبکر وعمر وعثمان وعلی (رضوان اللہ علیہم اجمعین) جیسے سیاستدانوں، مدبروں اور منتظموں نے اور خالد بن ولید اور ابوعبیدہ (رضوان اللہ علیہما) جیسے سپہ سالاروں نے رکھی تھیں اور روم وایران کی اس وقت کی سپر طاقتیں ان کے سامنے ریت کی دیوار ثابت ہوئی تھیں۔ صحابہ کرامؓ نے یہ تدبر، یہ حوصلہ، یہ استقلال، یہ بہادری، یہ جنگی

چالیں، بہترین گھوڑے اور اسلحہ اور اسلحے کا بہترین استعمال، یہ سب کہاں سے سیکھا تھا؟ یہ سب نبی کریم ﷺ کی تعلیم وتربیت کا نتیجہ تھا۔ یہ ایمان کی پختگی، آخرت پر یقین اور عمل صالح کا ثمر تھا۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ پہلے آدمی کو بدلو، ایمان کی پختگی، آخرت پر یقین اور عمل صالح کے ذریعے، جب یہ تبدیلی سچ مچ اور صحیح خطوط پر آئے گی تو پھر سیاسی ومعاشی استحکام، اسلحی برتری اور سائنس وٹیکنالوجی کی پیش رفت ...... یہ سب کچھ اس کے نتیجے میں خود بخود اس طرح ظاہر ہوگا جس طرح صدر اسلام میں ہوا تھا، لہٰذا مسلمانوں کے ضعف کا حتمی اور یقینی علاج یہ ہے کہ انہیں ان کی قوت کے منبع یعنی ان کے دین سے جوڑ دیا جائے۔ یہی مسلمانوں کی قوت وترقی کی شہ کلید ہے۔ مسلم معاشرہ جب حقیقتاً اپنے اللہ سے جڑ جاتا ہے تو پھر اللہ کی رحمت بھی جوش میں آتی ہے اور اس کے حکم پر زمین بھی اپنے خزانے اس کے لیے اگل دیتی ہے اور آسمان بھی اس پر ہن برساتا ہے۔ [۱] یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ سے بڑھ کر سچا وعدہ کس کا ہوسکتا ہے؟ [۲] اور یہ امت مسلمہ کا عملی تجربہ بھی ہے لہٰذا اس میں شک وشبہے کی گنجائش ہو ہی نہیں سکتی۔

بلکہ اگر آپ تدبر کریں تو دیکھیں گے کہ یہی ساری قوموں کی کامیابی کا نسخہ ہے۔ اہل مغرب اگر آج اپنے نظریۂ حیات پر عمل چھوڑ دیں (یعنی سیکولرزم، جمہوریت، سرمایہ داری پر) تو وہ بھی کمزور ہو جائیں گے، ان کی خوبیاں بھی آہستہ آہستہ ختم ہو جائیں گی اور وہ انہی قرون مظلمہ میں واپس لوٹ جائیں گے جن سے نکل کر وہ آج کامیابی کے پھریرے چار سو لہرا رہے ہیں۔

ہاں! مسلمانوں اور کافروں کی دنیا طلبی اور تسخیر کائنات میں ایک بنیادی فرق ہے اور یہ فرق بنیادی اور جوہری ہے۔ یہ انتہائی اہم بات ہے جسے کوئی مسلمان بھول نہیں سکتا اور نہ اسے بھولنی چاہیے کہ کافر دنیا طلب کرتا ہے کہ اس کا ہدف صرف دنیا ہوتی ہے

۱۔ ہود ۱۱:۵۲

۲۔ النساء ۴:۸۷

اور مسلمان بھی دنیا طلب کرتا ہے اور اس کے لیے کوشش کرتا ہے لیکن اس کا آخری ہدف دنیا نہیں آخرت ہوتی ہے۔ اس کا آخری ہدف یہ ہوتا ہے کہ اس کا خالق و مالک، اس کا رب، اس کا اللہ اس سے راضی ہو جائے۔ وہ ہر قیمت پر اللہ کی خوشنودی چاہتا ہے، آخرت کی کامیابی چاہتا ہے، خواہ دنیا کی کامیابی ملے یا نہ ملے۔ لیکن یہ اللہ ہی کی مشیت ہے، اسی کا اصول ہے کہ اگر تم اسُ کے بن جاؤ گے تو پھر یہ دنیا بھی تمہارے آگے بچھ جائے گی اور ساری کائنات تمہارے آگے جھک جائے گی۔

اسی لیے ہم کہتے ہیں اور بار بار کہتے ہیں، دلائل دے کر کہتے ہیں، جذباتی ہو کر کہتے ہیں کہ مسلمان اگر دنیا میں ترقی کرنا چاہتے ہیں تو انہیں چاہیے کہ مغرب کی پیروی نہ کریں، اسلام کی پیروی کریں۔ مسلمان، اگر مسلمان رہتے ہوئے، بے دین مغرب کی پیروی کریں گے تو انہیں ترقی اور کامیابی نہیں ملے گی، ذلت اور رسوائی ملے گی کیوں کہ اسلام اور مغرب کے اصول ایک دوسرے کے الٹ ہیں۔ اگر مسلمان محض دنیا کی ترقی چاہتے ہیں تو کافر ہو کر نظام کفر کے وفادار بن جائیں تو انہیں دنیا ملے گی اور ضرور ملے گی (جیسے کہ اس وقت کفار اہل مغرب کو ملی ہوئی ہے) لیکن وہ آخرت سے محروم رہیں گے۔ اور اگر وہ آخرت اور دنیا دونوں کی کامیابی چاہتے ہیں تو اس کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ وہ اللہ کی رضا کی خاطر آخرت کے طلب گار بن جائیں اور اس کے احکام کے مطابق دنیا کی زندگی گزاریں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ اصول قرآن حکیم میں واضح طور پر بیان کر دیا ہے کہ جو محض دنیا چاہتا ہے، اللہ اسے دنیا دیتا ہے لیکن وہ آخرت سے محروم رہتا ہے اور جو آخرت چاہتا ہے تو اللہ اسے آخرت تو دیتا ہی ہے ساتھ دنیا بھی دیتا ہے (بشرطیکہ وہ اس کی شرائط پر پورا اترے)۔[1] اس سے بڑھ کر دلیل ایک مسلمان کے لیے کیا ہو سکتی ہے؟

پس جو مسلمان دنیاوی ترقی کے لیے مغرب کی پیروی کو ناگزیر ٹھہراتے ہیں وہ احمقوں

۱۔ الشوریٰ ۴۲: ۱۹، ۲۰

کی جنت میں بستے ہیں۔ وہ ایک بے تکی اور غیر منطقی بات کہتے ہیں جو عملاً ممکن نہیں۔ یہ اجتماع ضدین ہے، آگ اور پانی کو یکجا کرنا ہے۔ دنیا میں ایسا ہوتا نہیں، ہوسکتا نہیں۔ مسلمان اگر دنیا میں ترقی کرنا چاہتے ہیں تو اس کی ایک ہی صورت ہے کہ وہ اسلام سے مخلصانہ وابستگی اختیار کرلیں، آخرت کے طلب گار بن جائیں، ہر قسم کے کفر و نفاق سے چھٹکارا حاصل کرلیں، اسلامی تعلیمات پر عمل میں یکسو ہوجائیں۔ انہیں دنیا بھی ملے گی اور آخرت بھی اور اگر انہوں نے مغرب کے بے دین نظریۂ حیات اور تہذیب کی پیروی کی تو نہ دنیا ملے گی اور نہ آخرت۔ اب عقل و منطق اور دلیل کا تقاضا کیا ہے؟ اس کے لیے بہت عقل کی ضرورت نہیں!

تلخیص مباحث ونتائج بحث

ایک مسلمان کے لیے، جب تک وہ مسلمان ہے اور مسلمان رہنا چاہتا ہے، اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ اور آپشن ہے ہی نہیں کہ وہ اپنے اللہ کو راضی کرنا چاہے اور اپنی خوشی ورغبت سے اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرے۔ اور ہر اس راستے اور عمل کو چھوڑ دے جو اسے اللہ سے دور لے جانے والا ہو، اس کے احکام کی نافرمانی پر منتج ہوتا ہو اور اس کی ناراضی کا سبب بن سکتا ہو۔ مسلمان جب تک اس اصول پر کاربند رہے، مضبوط اور طاقت ور رہے، ان کی فکر اور تہذیب ہی دنیا میں غالب وسر بلند رہی اور دوسرے لوگ اور قومیں ان کا اتباع اور ان کی خوشہ چینی کرتی رہیں لیکن جب مسلمانوں نے دینی تعلیمات پر عمل چھوڑ دیا، دینی تقاضوں کو پورا نہ کیا تو وہ کمزور ہو گئے۔ انہیں ذلت وادبار نے آلیا اور حریف قوموں نے انہیں دبا لیا۔

مغربی استعمار ایک عرصے تک مسلمان ممالک پر قابض رہا ہے اور اب بھی اپنے سیاسی، حربی اور معاشی تفوق کی بنا پر مسلمان معاشروں پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ اس نے ماضی میں بھی یہ کوشش کی اور اب بھی کر رہا ہے کہ وہ اپنی فکر، اپنی تہذیب اور اپنی ثقافت کو مسلمانوں پر مسلط کر دے اور کیسے رکھے۔ اور انہیں اگر عملاً غلام نہیں رکھ سکا تو سیاسی، حربی، تہذیبی اور ذہنی ونظریاتی طور پر اپنا غلام بنا کر رکھ سکے۔

مسلمان معاشرے کے صالح عناصر کی مقدور بھر مزاحمت کے باوجود شعوری اور لاشعوری طور پر مغربی فکر وتہذیب کے بہت سے اثرات مسلم معاشرے میں در آئے ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی فکری وعملی زندگی کا حصہ بن گئے ہیں اور اب بہت سے لوگوں خصوصاً نئی نسل کو ان کے اجنبی اور غیر اسلامی ہونے کا، بسا اوقات، احساس بھی نہیں ہوتا لہٰذا ضرورت محسوس ہوتی تھی کہ ان درآمد شدہ افکار ونظریات، رویوں اور اعمال کی نشان دہی کی جائے اور ان کا اجنبی اور غیر اسلامی ہونا امت پر

واضح کیا جائے۔ یہی کام اس کتابچے میں کیا گیا ہے اور برصغیر خصوصاً پاکستانی تناظر میں کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے ابتدائی مبحث میں اس صورت حال کے اسباب ومظاہر پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے۔

پھر ہمیں خیال آیا کہ ان درآمدی نظریات کے مطالعے کے بعد ممکن ہے کسی قاری کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ مسلمان اس غیر اسلامی فکر وتہذیب کی پیروی کی دلدل سے اگر نکلنا چاہیں تو کیسے نکلیں؟ لہٰذا ہمیں مناسب محسوس ہوا کہ اس سوال کا جواب بھی برسرموقع دے دیا جائے چنانچہ ہم نے اسے تیسرے مبحث کا موضوع بنایا ہے۔

اللہ کرے ہم لوگ خصوصاً ہماری نوجوان نسل مغربی فکر وتہذیب کے سحر سے نکلے، اسے خلاف اسلام ہونے کی بنا پر شعوری طور پر رد کرے، اپنی تابندہ تاریخ، فکر اور تہذیب پر اس کا اعتماد اور فخر بحال ہو اور اسلامی فکر وتہذیب کے سیدھے اور سچے راستے پر چل کر دنیا وآخرت میں کامیابی کی منزل تک پہنچنے کا سودا پھر اس کے سر میں سما جائے، وما ذلک علی اللہ بعزیز.
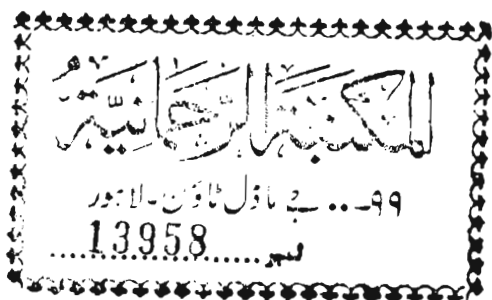
امت مسلمہ کی یہ خوش نصیبی ہے کہ ان کے ہاں عقیدہ اور تہذیب کی تعلیم پہلے پیش کی گئی اور پھر انہوں نے اس کی اساس پر ایک صحت مند ثقافت اور صالح تمدن کی بنیاد ڈالی۔ اہل مغرب نے بیومنزم، لبرلزم، سیکولرزم، کیپٹلزم اور امپیریلزم پر مبنی ثقافتی اور تمدنی روایات کو پہلے اپنایا اور اب وہ ان اقدار کے حوالے سے ایک مادہ پرستانہ تہذیب کی نیو اٹھانا چاہتے ہیں اور بزعم خود اس لادین رومی نژاد مغربی تہذیب کو پوری دنیا پر غالب کرنے کا خواب بھی دیکھ رہے ہیں۔

استعمار پسندانہ نوآبادیاتی نظام کی تین صدیوں میں اہل مغرب نے اپنے مقبوضات میں ایک ایسا نظام تعلیم ترتیب دیا کہ جس سے فارغ ہونے والی نسلیں مردم شماری کی حد تک تو مسلمان کہلائیں مگر اپنے فکر وعمل کے دائرے میں مغربی اقدار کی خوگر اور رسیا بن جائیں۔ استعماری قوتوں نے دوسری جنگ عظیم کے بعد ان مقبوضات کو بتدریج آزاد کیا تو زمام اقتدار فرنگی ذہنیت رکھنے والے اس طبقے کے سپرد کی جو اپنے آقایان ولی نعمت کی سرپرستی میں اسلامی حکومتوں پر براجمان اور ان کے ہمہ نوع مفادات کی حفاظت کرنے میں مستعد دکھائی دیتے ہیں۔

اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش صدیوں سے جاری ہے۔ اس تہذیبی اور ثقافتی آویزش نے عالم اسلام میں تین جہات پیدا کی ہیں۔ بعض طبقات نے مغربی تہذیب کو کلیتہً اپنا طرز حیات بنالیا ہے۔ چند ایک نے درمیانی راہ نکال کر اس سے ایک طرز مفاہمت پیدا کرلی ہے۔ اور صرف چند صاحب کردار اور باحمیت ایسے ہیں جنھوں نے کامل بصیرت اور گہرے ادراک کے ساتھ اس تہذیب کا استرداد کیا ہے۔ اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش مستقبل قریب میں کیا رخ اختیار کرے گی؟ محترم ڈاکٹر محمد امین جیسے ذی شعور اور جدید وقدیم علم سے آراستہ شخصیت نے اس نازک موضوع پر خامہ فرسائی کا حق ادا کیا ہے۔ امت مسلمہ کو ضعف واد بار کا جو موذی مرض لاحق ہے اس کے اسباب واضح اور تشخیص درست ہے مگر اس تہذیبی اور ثقافتی گرداب سے نکلنے اور مسلم نشاۃ ثانیہ کی راہ پر گامزن ہونے کے لیے ہمیں اپنے نظریہ حیات سے ہم آہنگ نظام تعلیم وتربیت کو سنجیدگی سے اپنانا ہوگا۔

ہم نظریاتی تعلیمی شعور اور اعلیٰ تحقیقی اسلوب ہی کے ذریعے امت مسلمہ کو درپیش چیلنجز کا حقیقی مقابلہ کرسکتے ہیں۔ مصنف نے بڑے منطقی اسلوب اور عمیق علمی تجزیے سے تہذیب مغرب کی دلدل اور ثقافتی بحران سے نکلنے کا سائنٹیفک حل تجویز کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ دردمند امت مسلمہ کے افراد کے لیے یہ علمی کوشش ان شاء اللہ چشم کشا اور بصیرت افروز ثابت ہوگی۔

پروفیسر عبدالجبار شاکر
ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل دعوۃ اکیڈمی
انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد

الحمد مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور۔ پاکستان
فون: 7320318 فیکس: 7239884
ای میل: hikmat100@hotmail.com

اردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔
فون: 2212991-2629724

ISBN 969-8773-52-5